دُعا عِبادت کا مغز ہے!

بنت مولانا سیف الرحمن قاسم

قرآن وحدیث میں دعاؤں کا انمول خزانہ ہے۔ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ کی مناجات مقبول اور حصن حصین میں مسنون دعاؤں کا انتہائی جامع مجموعہ ہے۔

اپنے والدین کو میں نے بچپن سے مناجات مقبول کا پابند پایا اور دیکھا دیکھی یہ عادت کسی نہ کسی حد تک ہم میں بھی منتقل ہوئی۔ اگر ہر مسلمان بہن کم از کم مناجات مقبول کی روزانہ کی ایک منزل پڑھنے کی ترتیب بنالے تو بے بہا فوائد حاصل ہوں گے۔

ہماری ایک بہت نیک عزیزہ ہیں۔ شاہین آباد میں اپنا مدرسہ چلاتی ہیں۔ انھوں نے مناجات مقبول کے متعلق ایک واقعہ سنایا۔ یہ عزیزہ قاری فتح محمد پانی پتی ثم مدنی کی فقط ایک واسطے سے شاگردہ ہیں۔ کہنے لگیں:

''میری ساس محترمہ تہجد گزار اور دعاؤں کا بہت اہتمام فرمانے والی تھیں۔ جب مجھے بیاہ کے لائیں تو اس وقت میرے جہیز کی کتابوں میں مناجاتِ مقبول بھی تھی۔ جو مجھے اپنے مدرسے سے انعام میں ملی تھی۔ میں نے انھیں وہ کتاب دکھائی اور استانی محترمہ کا حوالہ دیا کہ وہ بڑے اہتمام سے پڑھتی تھیں اور بتلایا کہ اس کے بہت فائدے ہیں۔ بس اسی دن سے مجھ سے مناجاتِ مقبول لے لی اور پڑھنی شروع کی۔ میرا اور ان کا پندرہ سال کا ساتھ رہا۔ پندرہ سال انھوں نے بڑی پابندی سے اسے پڑھا۔ سفر میں جانا ہوتا تو کہتیں: ''میری کتاب بھی بیگ میں رکھ دینا۔''

مناجات مقبول اور معمولاتِ درخواستی جس میں حضرت مولانا عبداللہ درخواستی رحمہ اللہ تعالیٰ کے صبح شام کے معمولات جمع تھے۔ ساس صاحبہ یہ دونوں کتابیں بہت اہتمام سے پڑھتی تھیں۔ قرآن پاک کی تلاوت تو پانچوں وقت کرتی تھیں۔ پڑھ پڑھ کے کتاب اور قرآن پاک کے صفحات جہاں سے ورق پلٹے ہیں، گھس گئے تھے۔ اُن کے انتقال کے بعد ان کے حلقۂ احباب میں سے ایک بزرگ خاتون نے خواب میں انھیں دیکھا اور پوچھا:

''آپاجی! آپ کو تو اللہ پاک نے بخش دیا ہوگا۔ کیونکہ آپ تو شب زندہ دار تھیں!''

خالہ جی کہتی ہیں کہ آپاجی نے مجھے اپنی کتاب دکھا کر کہا: ''مجھے اللہ پاک نے اس کتاب کی وجہ سے بخش دیا ہے۔''

اللہ پاک مجھے اور آپ سب کو پابندِ مناجات بنادے، آمین!

ایک شاعر نے دنیا سے جاتے ہوئے کیا خوب صورت اشعار کہے:

يَارَبِّ اِنْ عَظُمَتْ ذُنُوْبِیْ کَثْرَةً ۔۔۔ اِنْ کَانَ لَا یَرْجُوْکَ اِلَّا مُحْسِنٌ
فَلَقَدْ عَلِمْتُ بِاَنَّ عَفْوَکَ اَعْظَمُ ۔۔۔ فَبِمَنْ یَلُوْذُ وَیَسْتَجِیْرُ الْمُجْرِمُ

اَدْعُوْکَ رَبِّیْ کَمَا اَمَرْتَ تَضَرُّعًا ۔۔۔ مَالِیْ اِلَیْکَ وَسِیْلَةٌ اِلَّا الرَّجَا
فَاِذَا رَدَدْتَ یَدِیْ فَمَنْ ذَا یَرْحَمُ ۔۔۔ وَجَمِیْلُ عَفْوِکَ ثُمَّ اِنِّیْ مُسْلِمٌ

ترجمہ: اے میرے پروردگار! اگر میرے گناہ کثرت میں بہت زیادہ ہیں تو مجھے معلوم ہے کہ تیری معافی ان سے زیادہ بڑی ہے۔

اگر تیری امید صرف نیک آدمی ہی رکھے تو مجرم کس کی طرف جائے اور کس کی پناہ حاصل کرے؟

اے میرے پروردگار! میں تیرے حکم کے مطابق عاجزی سے تجھے پکارتا ہوں۔ اگر تُو میرے ہاتھ کو رد کردے تو کون رحم کرے گا؟ سوائے امید کے اور تیری اچھی معافی کے میرا کوئی وسیلہ نہیں پھر میں مسلمان بھی ہوں!

☆☆☆

بسم اللہ الرحمن الرحیم

القرآن

ارتکابِ معصیت کا ڈر

کہو کیا میں اللہ کو چھوڑ کر کسی اور کو مددگار بناؤں کہ وہی تو آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے اور وہی سب کو کھانا دیتا ہے اور خود کسی سے کھانا نہیں لیتا، یہ بھی کہہ دو کہ مجھے یہ حکم ہوا ہے کہ میں سب سے پہلے اسلام لانے والا ہوں اور یہ کہ تم (اے پیغمبر) مشرکوں میں نہ ہونا۔ یہ بھی کہہ دو کہ اگر میں اپنے پروردگار کی نافرمانی کروں تو مجھے بڑے دن کے عذاب کا خوف ہے۔

{سورۃ الانعام، آیات: 14، 15}

الحدیث

حوادثات ڈرانے کیلئے رونما ہوتے ہیں!

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں سورج گرہن ہو۔ آپ گھبرا کر مسجد تشریف لائے اور فرمایا: ''یہ حوادثات اللہ کی طرف سے ہیں، اُن کے وقوع پذیر ہونے میں کسی کی موت وحیات کا دخل نہیں، اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو ڈرانے کے لیے یہ حوادثات رونما کرتا ہے، جب یہ حوادثات دیکھو تو ذکر و دعا اور توبہ واستغفار کی طرف متوجہ ہوجایا کرو!''

{صحیح بخاری ومسلم}

بدگوئی

طوبیٰ آفرین

تمام والدین کو اپنی اولاد سے بے انتہا محبت ہوتی ہے۔ کوئی ماں یا باپ نہیں چاہتا کہ اس کی اولاد کو کوئی بھی تکلیف پہنچے۔ تمام والدین چاہتے ہیں کہ ہماری اولاد ہماری آنکھوں کے سامنے ہمیشہ ہنستی مسکراتی اور کھیلتی رہے۔ محبت تو سب ہی والدین کرتے ہیں، لیکن کچھ لوگوں کی عادت ہوتی ہے بات بات پر اپنی اولاد کو کوسنے کی، حالانکہ وہ دل سے ایسا نہیں چاہتے، مگر پھر بھی کر بیٹھتے ہیں۔ یہ بہت ہی بری بات ہے جس سے منع کیا گیا ہے۔

ہمارے ایک قریبی رشتے دار ہیں، اُن کا بچہ بہت پیارا مگر اتنا ہی شرارتی بھی تھا۔ پانچ سال عمر تھی۔ اُس معصوم سے میری تین یا چار مرتبہ ملاقات ہوئی ہے اور مجھے اُس بچے سے محبت ہوگئی تھی۔ اُس کی حرکتیں اور باتیں تھیں ہی ایسی دل موہ لینے والی کہ جو دیکھتا فدا ہو جاتا۔ عیدالاضحیٰ سے دو دن پہلے صبح اُس معصوم کے چچا کا فون آیا۔ غم سے نڈھال کہنے لگے:

''میرے عثمان کا انتقال ہوگیا ہے۔''

رات تین بجے یہ خبر سن کر اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ ہنستا کھیلتا بچہ چند دن پہلے ہی تو دیکھا تھا۔ اپنے والدین کا ایک ہی بیٹا۔

اور پھر مجھے کچھ یاد آیا۔

ایک مرتبہ وہ لوگ ہمارے گھر آئے تھے۔ اثنائے گفتگو عثمان کی ماں اس کے بارے میں بتاتے ہوئے کہنے لگیں: ''اف یہ اتنا تنگ کرتے ہیں کہ کیا بتاؤں؟ بہت زیادہ شریر ہیں، میں تو کہتی ہوں انھیں کچھ ہو جائے، کوئی چوٹ لگ جائے تاکہ یہ کچھ دیر سکون سے ایک جگہ تو بیٹھیں۔''

اور میں ہکا بکا ان کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔

عثمان کے ساتھ ہی اس کے تایا کا بیٹا بھی پیدا ہوا تھا۔ دونوں کی ایک ہی دن کی پیدائش تھی۔ تایا کا بیٹا صحت مند تھا، جبکہ عثمان بہت کمزور سا تھا۔ عثمان کو ایک ہفتہ انکیوبیٹر میں رکھا گیا تھا اور زندہ بچنے کے امکانات کم تھے لیکن اللہ کی قدرت وہ بچہ فوت ہوگیا اور عثمان کو اللہ نے زندگی دی۔ اس کی پھپھو اکثر یہ بولتی رہتی تھیں:

''یہ کمزور تھے لیکن بچ گئے وہ صحت مند تھا وہ فوت ہوگیا۔'' (نہ ماشاء اللہ نہ ہی الحمدللہ کا اضافہ)

پھر ایک دن عثمان کی ماں کسی تقریب کا احوال بتاتے ہوئے کہنے لگیں: ''عثمان نے تو وہاں مجھے اتنا تنگ کیا، 'وبال' بن گیا میرے لیے۔''

میں میت کے گھر پہنچ گئی۔

عثمان کی میت کے سامنے ماں کا رونا اور باپ کا درد دیکھا نہیں جا رہا تھا۔

باپ غم کی حالت میں رو رو کے مستقل ایک ہی بات کہہ رہا تھا: ''میری وجہ سے گیا ہے میرا بچہ میں نے ہی کل بولا تھا کہ قبر میں چلا جائے گا اور آج میرا بچہ قبر میں چلا گیا۔''

ہوا کچھ یوں تھا کہ ایک ہفتے سے بچے کو مستقل بخار کم زیادہ ہو رہا تھا۔ بخار کی وجہ سے بچہ چڑچڑا ہو گیا۔ اُس سے کچھ کھایا پیا بھی نہیں جا رہا تھا۔ باپ بہت پریشان تھا۔ باپ اپنے ہاتھ سے بسکٹ کھلا رہا تھا اور بچہ منہ میں لے کر تھوک رہا تھا۔ باپ کو یکدم غصہ آ گیا، غصے میں کہا: ''کھائے گا نہیں تو قبر میں چلا جائے گا۔''

اور اب اپنی وہی بات سوچ سوچ کر باپ کی حالت خراب ہو رہی تھی۔

گھر والوں نے موسمی بخار سمجھ کر زیادہ سنجیدہ نہیں لیا، جبکہ اُس معصوم کو ڈینگی ہو گیا تھا۔ بچے کا خون ٹیسٹ کروا کر ڈاکٹر کو رپورٹس دکھانے کے لیے اسپتال لے کر گئے تھے۔ ڈاکٹر کے آنے سے پہلے ہی بچے نے خون کی الٹیاں کیں اور فوت ہو گیا۔

اُن تمام باتوں کا مقصد صرف یہ ہے کہ کسی کے لیے بددعا یا بدفال منہ سے نہیں نکالیں، خصوصاً اپنی اولاد کے لیے۔ اکثر ماؤں کو بھی میں نے دیکھا ہے، غصے میں اپنی ہی اولاد کو بددعا دے دیتی ہیں: ''تیرا بیڑا غرق ہو'' یا ''ابھی تیرا مردہ نکالتی ہوں'' یا پھر ''اگر ایسا کیا تو جان سے مار دوں گی۔''

خدارا! ایسے برے کلمات نہ بولا کریں۔ کسی کے لیے بھی بولنا برا ہے مگر اپنی ہی اولاد کو کوسنا تو حماقت اور بدنصیبی کی انتہا ہے۔ یاد رکھیے ماں کی دعا تو عرش پر پہنچتی ہے۔ بے شک موت کا ایک وقت متعین ہے، لیکن نہ معلوم کون سا وقت قبولیت کا ہو اور آپ کی بات پر فرشتہ آمین کہہ دے۔ سو ہمیشہ خیر کے کلمات استعمال کرنے چاہییں، نیز بچوں کی کوئی بھی اچھی عادت اللہ کی تعریف کے ساتھ بیان کریں، یعنی ماشاء اللہ، الحمدللہ، سبحان اللہ جیسے کلمات کے اضافے کے ساتھ۔

بچے تو سب ہی شرارت کرتے ہیں بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ بچے شرارت کرتے ہی اچھے لگتے ہیں۔ ہم بہن بھائی بچپن میں شرارت کرتے تھے یا آپس میں لڑتے تھے تو میری امی غصے میں بولتی تھیں:

''ابھی آ کر تم سب کا بھلا کرتی ہوں۔''

کوئی نقصان ہو جاتا تھا یا کوئی چیز ٹوٹ جاتی تھی تو کہتی تھیں: ''تیرا بھلا ہو جائے۔'' پھر پٹائی لگتی تھی۔ بچپن میں ''بھلا'' کا مطلب ہی معلوم نہیں تھا۔ ہم سمجھتے تھے، پٹائی یا شامت آنا ''بھلا'' ہوتا ہے۔ بہن بھائی آپس میں لڑتے تھے تو میں کہتی تھی: ''نہیں لڑو امی آ کے ہم سب کا بھلا کر دیں گی۔''

بہرحال اس سے یہ معلوم ہوا کہ غصہ بھی آئے تو اچھے کلمات کی عادت بنا لینی چاہیے۔

مدیر اعلیٰ: مفتی فیصل احمد | مدیر: انجینئر مولانا محمد افضل احمد خان | مدیر مسئول: محمد فیصل شہزاد

''خواتین کا اسلام'' دفتر روزنامہ اسلام ناظم آباد 4 کراچی فون: 021 36609983 ای میل: fayshah7@yahoo.com

انٹرنیٹ: www.dailyislam.pk سالانہ زر تعاون: اندرون ملک 1200 روپے، بیرون ملک ایک میگزین 18000 روپے، دو میگزین 20000 روپے

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت

ڈاکٹر زاہدہ ثقلین ۔ بہاولپور

دو سالہ بیٹے کو تیز بخار تھا، وہ جو بھی دوا دیتی فوراً الٹی کر دیتا۔ آخر انجکشن منگوا کر لگا یا تو تے تھمی، پھر کہیں جا کر اس نے باقی دوا پی۔

بہن نے خیریت معلوم کرنے کے لیے فون کیا تو اُس نے صورت حال بتائی۔

اس نے حیرت کا اظہار کیا: ''ارے اپنے بیٹے کو خود ہی انجکشن لگالیا؟ ہاں بھئی ڈاکٹر ہونا، ڈاکٹروں کے دل مضبوط ہوتے ہیں۔''

اتنے سال گزرنے کے بعد بھی یہ جملہ ذہن میں تازہ ہے اور اس وقت بھی یہی سوچ ذہن میں آئی تھی کہ دل مضبوط ہوتے ہیں مگر ہوتے تو دل ہی ہیں نا! ڈاکٹر بھی تو روتے ہیں!

نشتر اسپتال ملتان میں گائنی کے تین وارڈ ہیں اور ایک مشترکہ لیبر روم اور آپریشن تھیٹر۔ ایمرجنسی کیس لیبر روم میں داخل ہوتے ہیں اور نسبتاً بہتر مریض وارڈ میں رہتے ہیں۔ ہم لیبر روم میں رات کی ڈیوٹی پر تھے کہ دو بجے ایک گائنی وارڈ سے ڈاکٹر صاحبہ کی کال موصول ہوئی۔

''میں ایک مریضہ کو لیبر روم بھیج رہی ہوں۔ اس کا بلڈ پریشر زیادہ تھا، اسے بلڈ پریشر کنٹرول کرنے کے لیے داخل کیا تھا، مگر اس کی طبیعت خراب ہوگئی ہے۔''

میں نے لیبر روم کے عملے کو الرٹ کر دیا۔

کچھ ہی دیر میں آیا جی اسٹریچر پر مریضہ کو لیے ہوئے آگئیں۔ مریضہ کی قمیص خون میں تر بتر تھی۔ فوری طبی امداد دی گئی۔ ساتھ آیا جی سے تفصیل پوچھی۔

''میڈم جی رات کو بلڈ پریشر چیک کیا تھا، ٹھیک تھا، یہ اپنے بیٹے کے ساتھ سو رہی تھی۔ پتا نہیں کس وقت اٹھ کر باتھ روم گئی تو وہیں اس کی طبیعت خراب ہوگئی اور ناک سے خون بہنا شروع ہوگیا۔ پتا نہیں کتنی دیر وہیں رہی، وہ تو ایک اور مریضہ باتھ روم گئی تو اُس نے اسے وہاں گرا دیکھ کر شور مچا دیا۔'' اسی وقت ایک اور آیا جی اس کے چار سالہ بیٹے کو لے کر لیبر روم پہنچ گئیں جو اپنی ماں کو پکارتا ہوا رو رہا تھا۔

''اس کا شوہر کہاں ہے؟''

مریضہ میں تشویش ناک حد تک خون کی کمی ہو چکی تھی، وہ حواس میں نہ تھی۔

''میڈم شوہر تو باہر کہیں سو رہا ہوگا، اُس کے ساتھ تو کوئی اور عورت بھی نہیں تھی۔''

گائنی وارڈز میں رات دس بجے مرد لواحقین کو باہر نکال کر دروازے بند کر دیے جاتے ہیں۔ وہ برآمدوں یا لان میں رات گزارتے ہیں۔

وارڈ کے ملازم کو بھیجا کہ باہر آواز لگائے اور اس کے شوہر کو ڈھونڈ کر لائے۔ لمحہ بہ لمحہ وقت گزر رہا تھا۔ بچہ ماں کو پکارتا رہا۔ ایک نرس اس کو سنبھالنے میں لگی رہی۔ باہر آوازیں لگتی رہیں اور مریضہ رب کے حضور پیش ہوگئی۔ رب کی رب ہی جانے مگر ہمیں لگا کہ ہمارا دل پھٹ جائے گا۔

لیبر روم کے پیچھے گیلری ویران رہتی تھی۔ وہاں جا کر آنسو بہائے مگر بس چند ہی منٹ، پھر لوٹ کر آنا پڑا کہ اور مریض بھی تھے، ایک کا غم منانے کا وقت کہاں تھا۔

☆......☆

تحصیل ہیڈ کوارٹر ہسپتال میں تعیناتی ہوئے ایک ہفتہ ہی ہوا تھا کہ ایک پولیس اہلکار دفتر میں داخل ہوا اور میرے سامنے فائل رکھتے ہوئے بولا:

''ڈاکٹر صاحبہ! پوسٹ مارٹم آیا ہے۔''

میرے تو ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ میڈیکل کالج میں کتابوں میں پوسٹ مارٹم کا طریقہ پڑھنا اور اساتذہ کی زیر نگرانی ایک آدھا کیس دیکھنا اور بات تھی اور خود سے سب کچھ کرنا اور بات۔ فوراً اپنی سینئر میڈم کو مدد کے لیے بلایا۔ وہ فوراً آگئیں۔ پہلے دفتر ہی میں بیٹھ کر رہنمائی کی، پھر ہمراہ لے کر مردہ خانے کی طرف گئیں۔

باہر متوفیہ کا شوہر دھاڑیں مار کر رو رہا تھا اور اس کا تین سالہ بیٹا حیران پریشان کھڑا تھا۔

اگر جو دیکھو تو چپ ہی رہنا

کسی کا کوئی راز، کوئی عیب، کوئی خامی، جرم علم میں آجائے تو اسے چھپانا (جیسے سوشل میڈیا پر کسی کی لیک ہونے والی ویڈیو یا آڈیو شیئر کرنا) مانگنا، دیکھنا اور وائرل کرنا بہت ہی سنگین گناہ ہے۔ جناب افتخار راغب نے کیا خوب کہا ہے۔

☆

کسی بشر میں
ہزار خامی
اگر جو دیکھو تو چپ ہی رہنا
کسی بشر کا جو راز پاؤ
یا عیب دیکھو
تو چپ ہی رہنا

☆

اگر منادی کو لوگ آئیں
تمھیں کریدیں
تمھیں منائیں
تمھاری ہستی کے گیت گائیں
تمھیں کہیں کہ
بشر میں دیکھی برائیوں کو بیان کر دو
تو چپ ہی رہنا

جواز یہ ہے دلیل یہ ہے
ضعیف لمحوں کی لغزشوں کو
حرام ناتوں کی قربتوں کو
ہماری ساری حماقتوں کو
ہماری ساری خباثتوں کو
وہ جانتا ہے
وہ دیکھتا ہے
مگر وہ چپ ہے
اگر وہ چپ ہے
تو میری مانو
وہ کہہ رہا ہے
کہ
چپ ہی رہنا!

ستارہ محی الدین ۔ کراچی

پولیس اہلکار کے مطابق متوفیہ اپنے شوہر کے ساتھ خوش و خرم زندگی گزار رہی تھی۔ قاتل اس سے شادی کرنا چاہتا تھا مگر نہ ہوسکی پھر تعلقات کی کوشش کی مگر عورت نہ مانی تو اس نے ٹوکے کا وار کرکے اسے قتل کر دیا۔

"ٹوکا؟" میں نے حیرت سے کہا۔

"جی ڈاکٹر صاحبہ! وہ بڑا سا چھرا نہیں ہوتا جو گوشت کاٹنے کے کام آتا ہے۔" اس نے سمجھایا۔

میں میڈم کے ساتھ مردہ خانے میں داخل ہوئی۔

متوفیہ کی عمر بیس، بائیس سال ہوگی۔ اس کے کپڑے خون میں لت پت تھے۔ بظاہر کہیں زخم نظر نہ آتا تھا۔ میڈم نے سر کو بائیں طرف کروٹ دی تو میں گھبرا کر دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔ تیز دھار ٹوکے نے گردن کو صفائی سے کاٹ دیا تھا۔ صرف بائیں طرف سے کچھ پٹھے اور گردن کی جلد سلامت تھی جس سے سر جسم کے ساتھ جڑا ہوا تھا۔

انتہائی اعصاب شکن حالات میں سب کام ہوا۔ میرا تو دماغ ماؤف ہو رہا تھا۔ میڈم بتاتی گئیں اور میں میکانکی انداز میں لکھتی گئی۔

دل کا درد مزید سوا ہوگیا، جب یہ انکشاف ہوا کہ مرحومہ چار ماہ کی حاملہ بھی تھی۔

جیسے تیسے کام مکمل ہوا۔ دوپہر کو گھر لوٹی تو عجیب طبیعت تھی۔ اپنے آپ کو بچوں اور گھر کے کاموں میں مصروف رکھا، مگر جب رات کو بچے سوگئے اور کام بھی نمٹ گئے تو جو رونا شروع کیا تو آنسو تھمتے ہی نہ تھے۔ اُس بے چاری کا چہرہ نظر کے سامنے سے ہٹتا ہی نہ تھا۔ میں بار بار بولتی کہ کوئی اتنا ظالم کیسے ہوسکتا ہے؟

اگلے دن میڈم کو بتایا تو بولیں:

"زاہدہ! یہ نارمل ہے۔ ہر پوسٹ مارٹم کے بعد بہت ڈپریشن ہوجاتا ہے۔"

بہر حال سنبھلنے میں کافی دن لگ گئے، مگر آج بھی دل کا ایک حصہ دکھی ہے۔

☆......☆

گائنی کے لیبر روم میں رات بارہ بجے ایک مریضہ پاؤں پر چل کر آئی۔ ابھی اُس سے ابتدائی ہسٹری ہی لے رہی تھی کہ اسے دورے پڑنا شروع ہوگئے۔

ہنگامی طور پر اس کو طبی امداد دی گئی۔ ایسے مریضوں کے لیے تین اقدام ضروری ہوتے ہیں۔ دوروں پر قابو پانا، بلڈ پریشر نارمل کرنا اور بچے کی پیدائش کروانا (نارمل یا آپریشن، جس طریقے سے بھی جلد ممکن ہو) اُس مریضہ کے لیے بھاگ دوڑ کرتے صبح کے آٹھ بج گئے۔

تھک گئے تھے مگر خوشی تھی کہ آپریشن بھی ہوگیا۔ دو گھنٹوں سے دورہ بھی نہیں پڑا اور بلڈ پریشر بھی ٹھیک تھا۔

ہماری ڈیوٹی ختم ہوئی، صبح کا عملہ آیا، ابھی ہم انھیں مریضوں کے متعلق بتا ہی رہے تھے کہ اس مریضہ کو اچانک سانس میں دشواری کا سامنا کرنا پڑا۔

سب متوجہ ہوگئے۔ پوری کوشش کی مگر دس منٹ کے اندر اندر سب ختم ہوگیا......!

Embolism...... دماغ میں کلک ہوا۔ کچھ دیر پہلے کی ساری خوشی خاک میں مل گئی اور بھاری قدموں سے لیبر روم سے باہر آئے۔

بہت سے اور مواقع بھی آئے جب کبھی آنسو دل پر گرے، کبھی دامن پر۔ وہ پندرہ سالہ لڑکی جس کی ماں انتہائی پریشان تھی کہ الٹی نہیں رک رہی تھی۔ دوائیاں بدل بدل کر دیکھ لیں، خون کے ٹیسٹ کروا لیے مگر کوئی افاقہ نہیں۔ آخر بھاری دل کے ساتھ پیشاب کا ٹیسٹ کروایا جس کی رپورٹ مثبت آئی۔

جب ماں کو بتایا تو اُس کی رنگت سفید پڑگئی اور وہ گرنے کے سے انداز میں بیٹھ گئی۔

"یہ پیدا ہوتے ہی مرجاتی تو اچھا تھا۔"

وہ مریضہ جس کے سیزیرین سیکشن کے دوران بچے کی پیدائش کے بعد خون کا اخراج ہی نہیں رک رہا تھا۔ ہر طریقہ اپنا کر دیکھ لیا۔ آخری حل ہوتا ہے کہ بچہ دانی کو نکال دیا جائے تاکہ ماں کی جان بچائی جاسکے۔ آپریشن تھیٹر کا سارا عملہ ہی پریشان تھا، میں تیزی سے مریضہ کا چارٹ اٹھا کر انتظار گاہ میں اس کے شوہر کے پاس گئی کہ بچہ دانی نکالنے کے اجازت نامے پر دستخط کردے۔ اسے صورت حال بتائی مگر وہ اجازت دینے سے انکاری: "بچہ دانی نکال دی تو آئندہ بچہ کیسے ہوگا؟"

"بھئی ماں بچے گی تو بچہ ہوگا نا۔" اس کے ساتھ سر کھپائی سے کچھ حاصل نہ ہوا۔ اِدھر ایک ایک لمحہ قیمتی تھا۔ قطرہ قطرہ زندگی ہاتھ سے پھسلتی جارہی تھی۔ آخر پروفیسر صاحب کے پاس پہنچی اور روہانسی آواز میں مریضہ کے شوہر کا جواب سنایا۔

انھوں نے ذرا دیر کو سوچا اور کہا: "آپ کردیں، شوہر کو میں دیکھ لوں گا۔"

کلمہ شکر پڑھتے ہوئے میں نے آپریشن تھیٹر کی طرف دوڑ لگا دی اور مریضہ کی بچہ دانی نکال دی۔

خون کا اخراج رک گیا اور الحمدللہ وہ مریضہ صحت یاب ہوکر گھر گئی۔ ☆☆☆

ایک مومنہ کی کہانی اس کا آشیانہ تنکا تنکا بکھر گیا تھا

بنت الاسلام

آج شام سے صالحہ بیگم کو کچھ افاقہ تھا۔ اُن کی آنکھ لگ گئی۔ منیرہ اور زبیدہ ممانی کئی راتوں سے مسلسل جاگ رہی تھیں۔ جونہی صالحہ بیگم کی آنکھ لگی، منیرہ نے زبردستی زبیدہ ممانی کو بھی لٹا دیا اور ان کے اوپر لحاف اوڑھا کر چاروں طرف سے بند کرتے ہوئے بولی:

''بس ممانی جان! اب اگر آپ اٹھیں تو میں سچ مچ روٹھ جاؤں گی۔ ذرا خیال کیجیے آج چار راتیں ہوگئیں آپ کو جاگتے ہوئے۔ اگر آپ بھی پڑ گئیں تو پھر میں دو دو مریضوں کو کیسے سنبھالوں گی!''

زبیدہ ممانی خود تھکان اور نیند سے گری پڑ رہی تھیں، تاہم انھوں نے لحاف کے اندر سے احتجاج کیا:

''میری بچی! میں جاگتی رہی ہوں تو تم کون سا آرام کرتی رہی ہو۔ میرا تو خیال تھا کہ تم ذرا لیٹ جاتیں اور میں آپا کے پاس بیٹھتی۔ تمھیں صبح بچوں کے ساتھ بھی نپٹنا ہے۔''

مگر یہ بات انھوں نے صرف منہ ہی سے کہی۔ اُن میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ اٹھ بیٹھیں۔ وہ خود اب دمے کی مریض ہو چکی تھیں۔ جب ان پر دمے کا دورہ پڑتا تھا تو وہ کئی کئی ہفتے زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا رہتی تھیں، پھر لوٹ پوٹ کر ٹھیک ہو جاتیں تو دوبارہ پھرنا شروع کر دیتیں۔ میاں کا وہی عالم تھا۔ اُن کا سارا دن اور رات کا بہت سا حصہ گھر سے باہر کٹتا۔ بڑا لڑکا سعودی عرب میں ملازم ہو چکا تھا۔ وہ اپنے بیوی بچوں کو لے کر وہیں رہتا تھا۔ چھوٹا جہلم میں ملازم تھا۔ کبھی چھٹی کے دن آ جاتا ورنہ زیادہ تر اپنی ملازمت پر ہی رہتا۔ زبیدہ ممانی نے دور پرے کے غریب رشتے داروں کے ایک کنبے کو گھر کا نیچے کا حصہ دے رکھا تھا تاکہ گھر میں رونق بھی رہے اور گھر کی حفاظت بھی ہوتی رہے۔

صالحہ بیگم اور صالحہ بیگم کی اولاد خصوصاً منیرہ سے اُن کی محبت کا وہی عالم تھا۔ خصوصاً اب اس گھر پر جو بپتا پڑی تھی، اُس نے ان کی محبت کو اتنا بڑھا دیا تھا کہ وہ اپنا زیادہ وقت یہیں کاٹتی تھیں۔ صالحہ بیگم کی بیوگی اور منیرہ کی کسمپرسی نے ان کے دل کے ٹکڑے اڑا دیے تھے۔ وہ اب اتنی رقیق القلب ہوگئی تھیں کہ بات بات پر رو پڑتی تھیں اور عجز کا یہ حال تھا کہ کہاں تو کبھی ناک پر مکھی بیٹھنے نہیں دیتی تھیں اور کہاں اب یہ عالم تھا کہ امجد کی دلھن نوشابہ اُن کے منہ پر ہزار بات کہہ جاتی اور وہ الٹ کر جواب ہی نہ دیتیں۔

منیرہ کو تسلی ہوگئی کہ زبیدہ ممانی سوگئی ہیں تو وہ دبے پاؤں دوسرے کمرے میں چلی گئی اور الماری سے وہ خط نکال لیا جسے وہ پچھلے دو ڈھائی مہینے سے روزانہ پڑھتی چلی آرہی تھی۔ آٹھ دس صفحے کے اس لمبے مکتوب میں الفاظ جگہ جگہ پھیلے اور سمٹے ہوئے تھے جس سے معلوم ہوتا تھا کہ اسے لکھتے ہوئے ماجد مسلسل روتا رہا ہے۔

''منیرہ! کوئی لمبی چوڑی تمہید باندھے بغیر میں تمھیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ پاداشِ عمل کا دور شروع ہو چکا ہے۔ میں نے زندگی میں جو کچھ بھی کیا تھا، اب وہ وقت آ گیا ہے کہ میں اس کی سزا بھگتنی شروع کر دوں۔

تمھیں شکوہ رہا ہے کہ میں نے ہمیشہ تم سے راز چھپائے، لیکن تم یہ کبھی نہیں جان سکیں کہ میں نے ایسا کیوں کیا؟ درحقیقت تمھارا کردار شروع سے میری نگاہوں میں اتنا بلند رہا کہ میں یہ کبھی گوارا نہ کر سکا کہ میرے کردار کی پستی سے تم واقف ہو جاؤ۔ ورنہ تم جانتی ہو کہ میرے جیسے بے شمار راشی افسر ایسے ہیں جو اپنی بیویوں سے کوئی راز نہیں چھپایا کرتے۔ کیونکہ انھیں اس بات کا کوئی خطرہ نہیں ہوتا کہ وہ بیویوں کی نگاہوں میں گر جائیں گے۔ انھیں تسلی ہوتی ہے کہ وہ بیویاں بھی ویسی ہی بے کردار ہیں جیسے وہ خود، لیکن میرا معاملہ بالکل الگ تھا۔ میں نے صراحتاً ایک غلط راہ اختیار کی اور کیونکہ مجھے پورا یقین تھا کہ تم اس راہ پر میرے ساتھ قدم سے قدم ملا کر نہیں چلوگی، اس لیے میں اس پر تنہا چلتا رہا۔

یہ ہے تفصیل اس راز داری کی جس کا تم شکوہ کرتی رہی ہو اور آج جب ذلتوں، رسوائیوں اور مالی اور جسمانی تکلیفوں کی بلائیں منہ کھولے میرے سامنے کھڑی ہیں تو میرے دل میں اگر کوئی تسکین ہے تو صرف یہی ہے کہ جس غلط راہ پر میں چلا، میں تنہا ہی چلا اور تم منیرہ، جو میرے بچوں کی ماں اور میرے گھرانے کی ناموس ہو، تم نے کسی ذلیل راہ میں میرا ساتھ نہیں دیا۔ تم اندازہ نہیں لگا سکتیں کہ آج یہ احساس میرے لیے کتنا تسکین کا باعث ہے۔ اگر میرے جیسے حالات میں گھرے ہوئے کسی انسان کے لیے تسکینِ قلب کا کوئی وجود ہو سکتا ہے تو......!

تم پوچھو گی میں نے تمھیں اب یہ خط کیوں لکھا ہے کہ جب حالات کو چند دنوں میں تم پر روشن ہو ہی جانا ہے۔ بات صرف یہ ہے کہ حالات نے کچھ ایسا رخ اختیار کر لیا ہے کہ جو غلطیاں میں نے واقعی کی تھیں، اُن کے علاوہ اور کچھ ایسی باتیں بھی میری طرف منسوب ہوگئی ہیں جن سے حقیقت میرا کوئی تعلق نہ تھا۔

میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر قسم کھا کر کہتا ہوں کہ نہ میرا کبھی اسمگلنگ سے تعلق رہا ہے اور نہ کسی قسم کی اخلاقی بدکرداری سے، لیکن مخالفین کے پاس جو دلائل ہیں وہ بظاہر اتنے مضبوط ہیں کہ اسی فیصد امکان اس بات کا ہے کہ وہ عدالت میں اپنے الزامات کو صحیح ثابت کروانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ پھر جو شخص واقعی اپنے

خواہشیں کیا کیا!

بنت منظور احمد۔ رحیم یار خان

ابو احمد کی خواہش تھی کہ میرا بچہ ہر چیز کھاتا ہو، اپنی ماں کی طرح نخرے والا نہ ہو۔ آج احمد نہ صرف کھانے والی چیز کھاتا ہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ شیمپو، صابن، پالش غرض کیڑے مکوڑوں کو بھی نہیں چھوڑتا۔

☆

ایمن کی امی چاہتی تھیں کہ میری بچی ایسی ہو جو زیادہ وقت سوتی ہو۔ پتا ہے ناں کہ سسرال کی کتنی ذمہ داری ہے۔ اب جو ایمن آئی تو وہ نہ صرف سوتی تھی بلکہ ایک دن تو نانی دادی کی نیند کی دوا کھا کر دو دن تک سوتی رہی۔

☆

محمد ذارون کے باقی بہن بھائی بہت بھولے معصوم سے تھے۔ اس کی دفعہ میں پھوپھو صاحبہ نے کہا کہ میرا بھتیجا ایسا ہو کہ جوسب کو ایکٹو رکھے۔ شرارتی سا ہو۔ ذارون صاحب دنیا میں آئے اور پاؤں پاؤں چلنے لگے تو سب کو دن میں تارے نظر آنے لگے۔ بلا کے شرارتی! ایک دن تو حد ہی کر دی۔ بیرون ملک خالہ کو کال ملا دی۔ ایک نمبر کے فرق کی وجہ سے کال کہیں اور چلی گئی۔ پھر کیا تھا۔ اگلے دن ہی PTCL آفس سے کال آئی کہ آپ کے نمبر سے انٹرنیشنل کال کی گئی ہے جس کا بل 6675 روپے ہے، آپ کو پتا ہے؟؟ اب تو سب کے ہاتھوں کے طوطے ہی اڑ گئے۔

☆

قارئین! یہ تو چند ایک واقعے ہیں آپ اپنے اردگرد نظر دوڑائیں تو کئی باتیں دیکھنے کو ملیں گی۔ ہمیں ایسی خواہش نہیں کرنی چاہیے جس پر بعد میں پچھتانا پڑے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں نیک، صالح، بے عیب اور خوب صورت وخوب سیرت اولاد سے نوازے۔ (آمین)

بچپن سہانا

ام عباد۔ فیصل آباد

زندگی کے بچپن کی طرح تعلیمی بچپن بھی بڑا سہانا ہوتا ہے۔

جی ہاں! تعلیمی بچپن...... جب انسان اپنی تعلیمی زندگی کا آغاز کرتا ہے تو وہ اس کا تعلیمی بچپن ہی تو ہوتا ہے، چاہے عمر کے اعتبار سے سن شعور ہی کیوں نہ ہو۔

تو جیسے زندگی کا بچپن "بچپن" تک بھی نہیں بھولتا اور حسین یادوں کے اَن مِٹ نقوش ہمیشہ کے لیے اپنے پیچھے چھوڑ جاتا ہے، بالکل یہی حال تعلیمی بچپن کا ہے۔ انسان علامہ فہامہ ہی کیوں نہ بن جائے، تعلیمی زندگی کی حسین یادیں ہمیشہ دل ودماغ میں ہلکورے لیتی رہتی ہیں۔ وہ سنگی ساتھیوں کے ساتھ چھوٹی چھوٹی باتوں پر لڑنا جھگڑنا اور پھر جلد ہی مان جانا، منالینا، ایک دوسرے کی چیزیں غائب کر کے تنگ کرنا، پھر سبق یاد کروانے یا کوئی چیز کھلانے کا وعدہ لے کر چیز واپس کر دینا، وہ بات بات پر بلاوجہ قہقہے لگانا، غرض یہ حرکتیں تعلیمی بچپن کی ہی غمازی کرتی ہیں اور بھلائے نہیں بھولتیں۔

زمانۂ تعلیم کے کچھ حیرت انگیز واقعات بھی دماغ کے کسی گوشے میں محفوظ ہو جاتے ہیں، ایسے واقعات یاد آنے پر ہمیشہ ایمان میں اضافے کا سبب بنتے ہیں، تو آیئے خود پر بیتنے والا ایسا ہی ایک یادگار واقعہ آپ کے گوش گزار کرتے ہیں:

زمانۂ تعلیم میں اگرچہ ہم خاص ذہانت کے مالک تو نہ تھے لیکن اتنے کمزور بھی نہ تھے۔ اللہ کے فضل، اساتذہ اور والدین کی دعاؤں سے ہمیشہ اچھے نمبروں سے پاس ہوتے رہے اور کوئی نہ کوئی پوزیشن ہمارے نام ہوتی رہی۔ اسی زمانے میں ایک ایسا واقعہ ظہور پذیر ہوا جس کی آج تک کوئی توجیہہ میں نہیں کر سکی۔ ہوا کچھ یوں کہ درجہ عالیہ والے سال جامعہ کے ششماہی امتحانات شروع ہونے والے تھے کہ ناگہاں میرا دایاں بازو فریکچر ہو گیا (ظاہر ہے کوئی شرارت کی ہوگی)۔

باجیوں کو بتایا تو انھوں نے کہا کہ ہم کسی چھوٹی جماعت کی لڑکی کو (جس کا اپنا امتحان نہ ہو) بھیج دیا کریں گی، تم اسے لکھواتی رہنا۔ ہم پریشان کہ اس طرح امتحان دینا تو ہمارے بس میں نہیں، یہ تو بہت مشکل ہو جائے گی اور اس بات کا بھی دھڑکا تھا کہ کہیں اس وجہ سے ہم پوزیشن سے ہی نہ رہ جائیں۔ سو ہمارے دل نے تو اِس تجویز کو یکسر مسترد کر دیا، لیکن اب پھر کریں تو کیا کریں؟

خیر! جس دن پہلا پرچہ تھا تو رات کو تہجد میں اٹھ کر اللہ سے خوب گڑگڑا کر دعا مانگی کہ یا اللہ! تیرے اختیار میں تو ہر چیز ہے، مجھ عاجز پر اپنا فضل فرما دے اور میرا بازو ٹھیک کر دے کہ میں خود لکھنے کے قابل ہو جاؤں۔

کافی دیر تک اسی طرح دعا کرتی رہی۔ دعا مانگ کر دل بالکل مطمئن ہو گیا۔ فجر کے بعد مدرسے چلی گئی اور اطمینان سے امتحان ہال میں جا کر بیٹھ گئی۔ باجی نے پوچھا کہ کسی کو مدد کے لیے بھیجوں؟ میں نے انکار کرتے ہوئے کہا کہ نہیں، میں خود کوشش کرتی ہوں۔

اور بہنو! شاید آپ کو یقین نہ آئے کہ جیسے ہی میں نے لکھنے کے لیے قلم ہاتھ میں پکڑا تو لگ ہی نہیں رہا تھا کہ یہ وہ بازو ہے جس سے میں پچھلے ایک ماہ سے معذور تھی اور کوئی چیز نہیں پکڑ سکتی تھی، بلکہ پٹی باندھ کر گلے کے ساتھ لٹکائے پھرتی تھی۔ لکھنا شروع کیا تو ایسی روانی کے ساتھ قلم نے لکھنا شروع کیا کہ جیسے کبھی کچھ ہوا ہی نہ تھا۔ دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ مجھ گناہ گار پر اتنا بڑا فضل اور احسان! میں تو اس قابل نہ تھی۔

الحمدللہ! سارے پرچے اسی طرح دیے اور کوئی پریشانی نہ ہوئی۔ جس ڈاکٹر سے پٹی کرواتے تھے وہ بھی حیران کہ ابھی تو اس بازو کو کم سے کم پندرہ دن اور بندھا رہنا تھا تو یہ اتنی جلدی کیسے ٹھیک ہو گیا؟

اب اسے کیا بتاتی کہ خدا اپنے بندوں پر اسی طرح فضل فرمایا کرتا ہے، چاہے اس کی کوئی توجیہ ہماری ناقص عقلوں میں نہ آ سکے۔ خدا کی قدرتِ کاملہ کے اس عجیب واقعے کے یاد آنے پر دل آج بھی تشکر کے جذبات سے لبریز ہو جاتا ہے اور زبان بے اختیار اُس کی حمد وثنا کے ترانے گانے لگتی ہے۔ ☆☆☆

کباڑ

ام مصعب

کباڑ کی ابتدا اور انتہا کے بارے میں شاید ہم میں سے کوئی نہ جانتا ہو لیکن اس کی اہمیت کا کس کو انکار ہو سکتا ہے۔ اسٹور، دو چھتی اس کے بنا سونے ہیں۔ کبھی کبھی یہ کباڑ چھت اور خالی کمرے میں بھی اپنی جگہ آسانی سے بنا لیتا ہے۔

ہمارے گھر کباڑ کی ابتدا اُس وقت ہوئی جب ننھا پاؤں پاؤں چلنے لگا تو اس کی واکر ہم نے چاہا کسی کو دے دیں لیکن میاں جی نے اسے اچھی طرح لپیٹ کر مچان پر رکھ دیا، یہ کہہ کر کہ ننھے کے آنے والے بھائی بہن چلائیں گے۔

اب چھے سال بعد جب ننھی کو واکر کی ضرورت پڑی تو واکر نکالی مگر وہ اس قابل نہ رہی تھی کہ ننھی چلاتی۔ کچھ موسم کے اثرات اور کچھ سامان اِدھر اُدھر ہونے کی وجہ سے واکر کا حشر نشر ہو چکا تھا۔

ہم نے صاحب سے کہا:

"اگر ہماری مان کر کسی کے بچے کو دے دیتے تو کیا ہو جاتا۔"

صاحب فوراً بولے:

"اگر اس کا استعمال چھے کی بجائے دو سال میں ہو جاتا تو کیا چلا جاتا؟"

اور یہاں ہمارے پر جلتے ہیں سو ہم لاجواب ہو کر خاموش ہو گئے۔

ننھی کی نئی واکر آ گئی اور پرانی واکر دوبارہ مچان پر چڑھ گئی۔

قصہ مختصر؛ یہ تحریر لکھنے سے پہلی والی نقل مکانی میں تین سوزوکیاں خالی کباڑ کی گئی تھیں۔

یقیناً بہنو! آپ کو حیرت ہو رہی ہوگی کہ ایسا کیسے ممکن ہے تو چلیے ہم آپ کی حیرت رفع کرنے کے لیے کباڑ کی فہرست بتاتے ہیں:

ایک ٹوکری بھر کھلونے جو نہ پھینکنے کے تھے نہ کھیلنے کے (ٹھیک ہونے کے انتظار میں اور خراب ہو رہے تھے)، چار پرانی پانی کی ٹنکیاں (ان میں سے کچھ ٹپکتی تھیں، کچھ بعد میں ٹپک گئی تھیں)، چھے قینچیاں، بارہ ٹوٹے ہوئے گلدان، چار پنجرے، دو جھولے، دو پرانے ٹائر، کچھ بائک کا بوسیدہ سامان، ٹوٹی پلاسٹک کی کرسیاں، دو ٹوٹی ایل سی ڈی، تین سی پی یو، ایک چولھا، دو انگیٹھیاں، پانچ پرانے کولر، ایک پرانا دروازہ، چار مٹکے، زنگ آلود کیلیں، پرانی سل اور ساس امی کے زمانے کی خراب مشینریاں، جنھیں کئی دفعہ میاں جی سے کہا کہ نکال دیں اور ہر بار میاں جی نے ایسے گھور کر دیکھا گویا ہم ان کی امی جان کو ہٹانے کا کہہ رہے ہیں!

اور ہاں، بہت سارے پرانے تار، اور ان تاروں کی بھی غضب کہانی ہے۔ ہر بار صفائی کرتے ہوئے میاں جی کو ہم کہتے ہیں کہ آخر یہ موٹے تار کس کام آئیں گے؟ وہ کوئی مصرف بتا دیتے تو ہم پوچھتے ہیں، چھوٹے تار......؟ تو کہتے، یہ بھی کام آئیں گے......اور یہ خراب تار؟ جواب ملتا ہے انھیں بھی دیکھنا پڑے گا کہاں سے خراب ہیں، سو تقریباً دس سال ہو گئے ان تاروں کے شاپر بدلتے۔

ویسے کچھ چیزیں ایسی بھی تھیں جن کو ہمارے میاں جی گھر سے نکالنے کی کوشش کرتے رہے لیکن وہ ہم کو عزیز تھیں۔ جیسے ہماری شادی کا شوکیس، میاں جی نے بڑی فراخ دلی سے کہا اسے نکال دیتے ہیں۔ ہم نے کہا جی کیسی باتیں کرتے ہیں؟ ہمارے جہیز کی دو ہی چیزیں تو بچی ہیں۔ ایک شوکیس اور دوسرے ہم......! پھر ہم نے اپنی آواز کو بھرائی ہوئی بنایا اور کہا: "کتنی محبت سے بھائی میرے کہنے پر شوکیس اور ڈریسنگ الگ الگ لائے تھے، بیماری کے باوجود خود سامان چڑھوا رہے تھے۔"

میں نے ایسا منظر کھینچا جیسے واقعی مجھے بھائی نظر آ رہے ہوں۔ وہ مرعوب تو نہیں ہوئے خاموش ضرور ہو گئے اور ہم بھی اوورایکٹنگ کی وجہ سے ضرورت سے زیادہ جذباتی ہو گئے۔ جھوٹ موٹ کا رونا سچ مچ کے رونے پر آ گیا۔

خیر ان کے علاوہ کم از کم دو بڑے ٹرنک "یادگاروں" سے بھرے ہوئے ہیں۔ اس میں شادی ولیمے کے کپڑے (میرے اور ان کے) اور بچوں کی پیدائش سے عقیقے تک کے کپڑے جو نہ پہننے کے قابل ہیں اور پھینکنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا......!

اکثر ہم کو ایسا لگتا ہے کہ ہمارے میاں جی کے پاس کباڑ کی پوری فہرست ہے، جب بھی نقل مکانی ہونے کے دوران کباڑ نکلتا ہے، یہ فہرست نکال کر کباڑ چیک کرتے ہیں کہ کوئی چیز اِدھر اُدھر تو نہیں ہو گئی۔ خیر اب تو ہمیں بھی کباڑ سے اتنی انسیت ہو گئی ہے کہ جھاڑو دیتے ہوئے کوئی زنگ آلود کیل یا کوئی لکڑی کا ٹکڑا اچھٹک کر راہ میں آ نکلے تو ہم اسے جھاڑ کر دوبارہ عقیدت سے کباڑ میں رکھ دیتے ہیں۔

جس دن ہماری رائٹنگ ٹیبل بن کر آئی، ہم بہت جذباتی ہو رہے تھے۔ ہم نے میاں جی سے کہا کہ اب مفتی ثناء اللہ صاحب آئیں تو آپ اُن سے درخواست کیجیے گا وہ یہاں بیٹھ کر کچھ لکھ دیں۔ ایسا ہم نے اس وجہ سے کہا کہ شاید اس برکت کی وجہ سے ہمارے قلم سے بھی فیض جاری ہونے لگے، اور ہم بھی چار پانچ اصلاحی کتب کے مصنفہ بن جائیں مگر یہ ہو نہ سکا، اور ہوا کیا؟

دو دراز بچوں نے اور ایک میاں جی نے لے لیا اور ہنگامی حالات میں اپنے اپنے حصے کا کباڑ درازوں میں بھر لیا۔ میاں جی نے پرانے پرانے قلم جن کی روشنائی سوکھے عشرے گزر چکے تھے اور پرانے کاغذات، جن میں ان کی پرائمری کے سرٹیفکیٹ، سالخوردہ یادگاری خطوط بھی تھے رکھے، جبکہ بیٹے صاحب ہمارے عالم بن رہے ہیں، تو انھوں نے عطر کی خالی اور بھری شیشیاں، دو پرانی گھڑیاں، چشموں کے ٹوٹے ہوئے فریم اور پلاسٹک کوٹنگ کیے ہوئے وہ نوٹ جو اُن کے اساتذہ نے انھیں شاباشی کے طور پر ان کو دیے ہوں گے، اپنی دراز میں بھر دیے۔

البتہ چھوٹے بیٹے نے اپنی عیدی کے نوٹ جو ابھی تک ان کے پاس تھے، دراز میں سجا کر رکھ دیے۔ ہم نے میاں جی سے بہت کہا کہ ان نوٹوں کو لے کر گل فروش کے پاس جا کر ایک نوٹوں کا ہار بنوا دیں۔ بنوائی کے پیسے ہم دیں گے، بچہ ہے خوش ہو جائے گا لیکن جناب ہماری سنتا کون ہے......!

کچھ ماہ بعد دراز کی چابیاں سمندر میں ڈال دی گئیں۔

بچوں کو کھانے کی طرف کیسے راغب کریں!

کھانے کے دوران باقی تمام چیزوں اور کاموں کو ایک طرف کر دیں۔ ہر طرح کی اسکرین کو منظر سے غائب کر دیں۔ والدین خود بھی اس سے دور رہیں۔ یاد رکھیے، والدین کا عمل ہی بچوں کا عمل ہوتا ہے۔ کوشش کریں کہ بچوں کو اکیلا مت کھلائیں، بلکہ سب گھر والے اکٹھے بیٹھ کر کھانا کھائیں اور کھانے کا باقاعدہ ماحول بنائیں۔

بچوں کا معدہ چھوٹا ہوتا ہے، اِس لیے اُن کی پلیٹ میں کھانا کم ہی ڈالیں۔ ایک دم سے پلیٹ مت بھریں، اگر انھیں ضرورت ہوگی تو وہ اور لے لیں گے۔ بعض اوقات بچے یکدم پلیٹ بھری دیکھ کر بھی کھانے سے اعراض کرتے ہیں۔ اِس لیے کم پورشن سائز رکھیں اور بچے کو یہی کہیں کہ آپ کا کھانا تو بہت تھوڑا سا ہے، آپ اسے ختم کرلیں اور ہم سے جیت جائیں۔

بچوں پر چیخنے چلانے اور ان پر زبردستی کرنے سے گریز کریں۔ بچوں کو مثبت طریقے سے کھانے پر ابھاریں، جیسے: ''دیکھتے ہیں کہ ہم میں سے کون زیادہ اچھی طرح پلیٹ صاف کرتا ہے، وہ جیت جائے گا۔'' اسی طرح کوئی انعام بھی مقرر کرلیں جیسے: جو اپنی پلیٹ بالکل صاف کرے گا اسے ایک انعام ملے گا، اور کوئی چھوٹا سا انعام تحفہ وغیرہ سوچ لیں۔

اس بات کو سمجھ لیں کہ یہ بالکل بھی ضروری نہیں ہے کہ آپ کا بچہ بھی اتنے ہی وقت کھانا کھائے گا جتنی بار آپ کھائیں گے۔ کسی وقت وہ اگر کھانا نہ بھی کھائیں تو پریشان نہ ہوں۔ ہوسکتا ہے کہ اسے بھوک نہ ہو اور ضرورت بھی نہ ہو۔ بچے کھانا کھانے سے اُس وقت بھی گریز کرتے ہیں، جب الا بلا اور فضول کی چیزوں سے ان کا پیٹ بھرا ہوتا ہے تو ظاہر ہے وہ ٹھیک سے کھانا نہیں کھا پاتے، کیونکہ انھیں بھوک ہی محسوس نہیں ہو رہی ہوتی، اِس لیے اس بات کو یقینی بنائیں کہ بچے باہر کی چیزیں، اسنیکس، پاپڑ، بسکٹ، چاکلیٹس وغیرہ کم سے کم کھائیں (زیادہ سے زیادہ دن میں ایک بار، اور اگر باہر کی چیزوں کی عادت نہ ہی ڈالیں تو بہتر ہے) تاکہ اُن کی بھوک باقی رہے اور کھانے کے وقت وہ غذائیت بھرا متوازن کھانا کھا سکیں۔ اسی لیے بچے کمزور ہوتے ہیں اور ان کی ٹھیک سے نشوونما نہیں ہو پاتی، کیونکہ وہ فالتو کی چیزوں سے اپنا پیٹ بھرا رکھتے ہیں اور روٹی، پھل، سبزی، گوشت اور غذائیت والی خوراک کے لیے خواہش ہی نہیں ہوتی۔

اس بات کا دھیان رکھیں کہ کھانے کے دوران ماحول خوشگوار ہو۔ ہلکی پھلکی مثبت گفتگو ہو۔ بچے کو بار بار ٹوکیں مت، نشانہ مت بنائیں، بلکہ اس کی ہلکی پھلکی شرارتوں کو نظر انداز کریں اور بالواسطہ اس کو اپنا کھانا ختم کرنے پر راغب کریں، جیسے کسی بڑے بچے یا ان کے بابا سے ایسی گفتگو کریں کہ بھئی کھانا تو مزے کا ہے۔ ہم کھائیں گے تو جلدی بڑے ہوں گے، طاقت آئے گی، کھانا تو اللہ میاں نے ہمیں دیا ہے، ہم خوش ہو کر کھائیں گے اور اپنی پلیٹ صاف کریں گے تو اللہ میاں ہم سے بہت خوش ہوں گے اور جب ہم کھانا کھا کر اللہ میاں کا شکریہ ادا کریں گے تو ہمیں انعام ملے گا وغیرہ وغیرہ۔

مائیں کوشش کریں کہ جب بھی ممکن ہو بچوں کو کھانا بنانے کے دوران اپنے ساتھ رکھیں۔ ان سے ہلکے پھلکے کام لیں جیسے یہ پکڑائیں۔ برتن سیٹ کر دیں۔ یہ چیز چکھ کر بتائیں۔ کھانا تو بہت مزے کا بننے والا ہے وغیرہ!

اسی طرح اگر کبھی ممکن ہو تو باورچی خانے کے لیے خریداری کرتے ہوئے انھیں بھی شامل کرلیں۔

اگلے دن کا مینو سوچتے ہوئے بچوں سے بھی پوچھیں۔

اور آخر میں وہی بات کہ بچوں کو باہر کی چیزوں اور ڈرنکس وغیرہ سے حتی الامکان دور رکھیں۔ کوشش کریں کہ انھیں گھر پر ہی روزانہ کوئی ایک مزیدار چیز بنا دیں۔ کبھی کوئی صحت مند مشروب، کبھی کچھ اور۔

اپنے بچے کی نفسیات کو سمجھیں۔ اس کے کھانے کے انداز اور عادات کو مدنظر رکھ کر اس کا کھانا تیار کریں۔ چیزوں کو پرکشش انداز سے بنا کر انھیں پیش کریں تاکہ بچے خوش ہو کر کھائیں۔

اگر ان سب ہدایات پر عمل کرنے کے باوجود آپ کا بچہ کھانے میں بہت تنگ کرے تو ایک بار اس کا ڈاکٹر سے چیک اپ بھی کروا لیں کہ آیا اسے کوئی الرجی یا کوئی اور مسئلہ تو نہیں ہے۔ ☆☆☆

حفصہ شکیل (ماہر غذائیات) وادی نلتر، گلگت بلتستان

بھئی اگر گھر میں ہوتیں تو ملتی بھی...... اب صرف ایک دراز میرے پاس ہے جس میں میری اور میری بیٹی کی پرانی چیزیں رکھی ہیں اور سارے کام کی چیزیں میز کے اوپر رکھی ہیں۔

یقین کریں میز پر گلدان اور قلم رکھنے کی بھی جگہ نہیں ہے۔ بس ایک دن پریشان ہو کر قلم اٹھایا اور لکھا۔

بھری ہوئی ہیں درازیں پرانی یادوں سے
کوئی بھی بات نئی لکھ کر ہم کہاں رکھیں

☆☆☆

5

انٹرویو باجی عامرہ احسان مدظلہا

> یہ سمجھ لیا کہ معیارِ حق نبی کریم ﷺ کے سوا کوئی ہستی نہیں۔ انبیائے کرام قرآن میں دل ونگاہ خیرہ کن نمونہ ہائے کردار وعمل ہیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جیسی بے مثل جماعت میرے اکابر قرار پائے۔ جب دیکھا انہی کو پلٹ پلٹ کر دیکھا!

(عمارہ مشتاق۔ پھول نگر)

سوال: خود آپ کو اپنی کون سی تحریر سب سے زیادہ پسند ہے؟ اور آپ کی کوئی تحریر جس پر قارئین کو بہت زیادہ فائدہ ہوتا دیکھ کر آپ حیران رہ گئی ہوں؟

جواب: 'غم ہو تو ایسا' پر قارئین کا ردِعمل یہ تھا کہ یہ ڈپریشن سے نکالنے اور زندگی بدلنے والا کتابچہ ہے۔

(ام سارہ۔ کراچی)

سوال: آپ کا قرآن الکریم سے تعلق کسی سے مخفی نہیں۔ آپ نے قرآن فہمی کے لیے کس تفسیر قرآن کو اپنا معیار بنایا ہے؟ نیز آپ کا تلاوت قرآن کا معمول کیا اور کیسا ہے؟ یعنی کتنا معمول ہے اور کیسے تلاوت کرتی ہیں؟ یعنی ترجمہ وتفسیر بھی ساتھ ساتھ دیکھتی ہیں؟

جواب: (ا۔۲) ایمانی زندگی کا آغاز تفہیم القرآن سے ہوا تھا۔ یونیورسٹی میں کچا کچھ سائنسی کہانیوں (تعلیم) سے بھرا ہوا دماغ۔ واحد ایمانی زندگی کو ثبات دینے والی چیز نماز کی پابندی تھی۔ (ابھی پردہ سمجھ میں نہیں آیا تھا!) قرآن صرف ناظرہ تھا کیونکہ لفظی ترجمہ (روانی نہ ہونے کی بنا پر) سمجھ میں نہ آتا تھا۔ گھر کی فضا میں عصری تعلیم کا بے پناہ غلبہ تھا۔ اسلام سے محبت اور وابستگی روایتی (بے عمل) مذہبیت کی تھی۔ دین نہ تھا، اسلام طرزِ زندگی نہ تھا۔ ایسے میں قرآن (یہ اللہ کی مشیت تھی) نے یکا یک یوں مجھے اللہ سے ہم کلامی عطا کی کہ میں دم بخود رہ گئی۔ تخلیقات پڑھتے اتنے سال گزر گئے۔ بے روح، لنڈے (تعلیم کا لنڈا بازار، گورے کا پس خوردہ) بازار نوعیت کی سائنسی کتب بددیانتی کی اس انتہا پر رہیں کہ خالق کا نام پوری تعلیم سے غائب تھا۔ قرآن کی یہ تشریحات وہ تھیں جن میں دلائل وامثال، تخلیقات کا تذکرہ (میرے لیے) اللہ کی کبریائی کچھ یوں جواہر کی طرح بکھری ہوئی تھی کہ دل ودماغ میں روشنی بھر دے۔ غم تھا تو یہ کہ جب سائنس پڑھی تو اللہ کو نہ پہچانتی تھی جس کی مبہوت کن تخلیقات، ایک مضبوط، مربوط، بے پناہ تنوع، حسن اور پیچیدگی کا حامل نظامِ فطرت پوری کائنات پر محیط ہے۔ اب قرآن ملا تو اس کے بعد بہرطور ایک تو نگاہ میں کچھ اور جچ ہی نہ سکتا تھا۔ اللہ کے تخلیق کے منصوبے میں عورت کا مقام، اس کو تفویض کردہ فرائض اور کردار پڑھ لیا تھا۔ دینِ فطرت جو ہوا، سو فطرت کی عمیق پکار تھی۔ میری صلاحیتوں کا مصرف ملازمتیں، ڈگریاں، گریڈ والی نوکریاں نہ تھیں۔ گھر اور خاندان کی بنیاد رکھنا تھی۔ تفہیم القرآن پر اعتراضات سنتی رہی۔ رہنمائی کے لیے ابنِ کثیر پڑھی، معارف القرآن بھی۔ اللہ کی بات، اس کے کلام کا حسن، اس کا پیغام جوہری طور پر یکساں تھا۔ اور مجھے تو اپنے رب سے جڑنا تھا۔ ماحول میں من وتو کی لے دے سے خود کو بالا رکھ کر یہ سمجھ لیا کہ معیارِ حق نبی کریم ﷺ کے سوا کوئی ہستی نہیں۔ انبیائے کرام قرآن میں دل ونگاہ خیرہ کن نمونہ ہائے کردار وعمل ہیں۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم جیسی بے مثل جماعت میرے اکابر قرار پائے۔ جب دیکھا انہی کو پلٹ پلٹ کر دیکھا۔ اولاد ہوئی۔ جب تیسرا بیٹا پیدا ہوا تو میں نے نام رکھنے کو تڑپ کر کہا کہ اللہ مجھے بیٹے دے اور ان میں سے ایک کا نام بھی عمر نہ ہو، سو وہ عمر قرار پایا...... خاموش طبع عمر...... ایمان اور اسلام کے اعتبار سے بحمد اللہ! اتنا ہی اٹل (جتنا نام کا تقاضا تھا) باذن اللہ ثابت ہوا۔ اللہ نے شعوری ایمان دے کر چار سال امریکا اپنی دنیا دکھانے اور چکا چوندی کفر کو بہ چشم سرد یکھنے کو بھیج دیا۔ رفیق سفر وہ دیا جس کی زندگی کا بیشتر حصہ اور تعلیم ساری انہی گوروں کے ہاں رہی تھی۔ مرعوبیت کی بجائے اپنی شناخت پر اصرار جزوِ زندگی تھا۔ سو وہاں قیام کے دوران قرآن میری زندگی کا مرکز ومحور رہا۔ ایمانی اعتبار سے وہ چار سال میری زندگی کا حاصل تھے۔ مصروفیات دینی ہی تھیں۔ سیر وتفریح کا نہ ذوق تھا نہ ان کی تعلیمی زندگی میں وہ فرصت۔ بازاروں کا بھی اللہ ہی کے فضل سے ادنیٰ ترین شوق نہ تھا نہ ہی طالب علمی کے دور میں فراوانی، سو وقت میرا اپنا رہا! یہ تمام تر تفصیلات (غیر ضروری) صرف اس لیے دے رہی ہوں کہ تعلق بالقرآن ایک پورے ماحول اور گزران کا نتیجہ تھا جس میں تھیوری اور پریکٹیکل ساتھ ساتھ رہا، جس روم کو تاریخ میں پڑھا، جس امریکا کا جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا وہ سامنے تھا اپنی پوری تہذیبی کس مپرسی اور متعفن اخلاقی گراوٹ کے ساتھ۔ قرآن ایک عظیم الشان تاریخ ازل تا ابد، پاکیزہ سکینت بخش معاشرت، حقیقی عدل وانصاف پیش کر رہا تھا۔ مرگ مفاجات والی معیشت کے برعکس اخوتِ باہمی، رحماء بینہم، برانصاف پاکیزہ نظامِ معیشت لیے جگمگا رہا تھا۔ نیویارک دنیا کی سبھی قومیتوں سے لبالب بھرا شہر تھا۔ وہ دور اسلام کے اعتبار سے امریکا میں اس وقت (ظاہراً) بہتر تھا۔ سو بلا خوف وخطر جو پڑھا وہ برتا اور دعوتِ دین بھی ساتھ چلتی رہی۔ وہاں جو بیٹا پیدا ہوا تھا شاید اسے یہی سب ملا تھا جس سے میرے رب نے مجھ پر کرم نوازی کی! یہ میرا رشتہ رہا قرآن سے۔

سوال: قرآن کریم کے حوالے سے اپنا کوئی حیرت انگیز واقعہ بتائیے۔ کبھی ایسا ہوا ہو کہ آپ کو کسی سوال نے پریشان کیا ہو، کسی دینی ودنیوی معاملے میں آپ تذبذب کا شکار ہو گئی ہوں کہ کیا کریں؟ اور اسی اثنا میں آپ نے قرآن پاک کھولا ہو اور اللہ میاں نے آپ کو جواب دے دیا ہو۔

جواب: قرآن کریم کے حوالے سے کبھی یا کہیں کا سوال نہیں، روزانہ کی بنیاد پر سبھی پڑھنے والوں کی طرح میرے لیے بھی یہ اللہ سے ہم کلامی ہے۔ (کلام اللہ ہے!) فیہ ذکرکم... اس میں ہمارے ہی تذکرے ہیں۔ وہ شہ رگ سے قریب ہے۔ علیم بذات الصدور ہے۔ اسمع وابصر... ھو معکم اینما کنتم... الا یعلم من خلق وھو اللطیف الخبیر ہے، پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ سوالوں کے جواب نہ دے، تذبذب دور نہ کرے۔ میری غلطی واضح نہ کرے۔ قرآن ہی مربی و

مزکی ہے۔اسے کھولتے ہی گویا آپ طور پر جا بیٹھتے ہیں۔اس حوالے سے میری محبوب ترین احادیث میں سے ترمذی کی حدیث کا کچھ حصہ پیش ہے: ’خبردار رہو! عنقریب ایک فتنہ برپا ہونے والا ہے۔‘‘ سیدنا علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں، میں نے عرض کیا: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! میرے لیے اس سے بچنے کی صورت کیا ہوگی؟ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کتاب اللہ، اس میں اس چیز کی بھی خبر ہے کہ تمہارے بعد میں آنے والوں پر کیا گزرے گی، اور اس چیز کا بھی ذکر ہے کہ تمہارے معاملات کے درمیان فیصلہ کرنے کی صورت کیا ہے۔ یہ قرآن ایک سنجیدہ اور فیصلہ کن کلام ہے، کوئی مذاق کی چیز نہیں ہے۔ جو کوئی ظالم و جبار شخص اس قرآن کو چھوڑے گا اللہ اس کو کچل کر رکھ دے گا اور جس شخص نے اسے چھوڑ کر کسی اور جگہ سے ہدایت حاصل کرنے کی کوشش کی اللہ اسے گمراہ کردے گا اور یہ قرآن اللہ تعالیٰ کی مضبوط رسی ہے اور یہ حکیمانہ نصیحت ہے اور یہی سیدھا راستہ ہے۔ یہ قرآن وہ چیز ہے کہ تخیلات اسے غلط راستے پر نہیں لے جاسکتے اور زبانیں اس میں کسی قسم کی آمیزش نہیں کرسکتیں اور علماء کبھی اس سے سیر نہیں ہوسکتے اور خواہ اس کو کتنا پڑھو یہ پرانا نہیں ہوتا اور اس کے عجائبات کبھی ختم نہیں ہوں گے...... جو شخص قرآن کے مطابق بات کرے گا وہ سچی بات کرے گا اور جو اس کے مطابق عمل کرے گا ضرور اجر پائے گا اور جو اس کے مطابق فیصلہ کرے گا ضرور عدل کا فیصلہ کرے گا اور جو لوگوں کو اس کی پیروی کی دعوت دے گا وہ سیدھے راستے کی طرف لوگوں کی رہنمائی کرے گا۔‘ (ترمذی، دارمی)

سو یوں سمجھیے کہ اس حدیث کو مرکز و محور بنایا اپنی تعلیم اور فہم کا۔ یہی مصدر ہے میرے فکر و عمل کا۔ غلطیاں، کوتاہیاں بے حساب ہیں۔ خوش گمان لوگوں سے خوف آتا ہے۔ اللہ پردے پردے میں معاف کرکے اپنی شانِ کریمی سے سلامتی کے گھر تک پہنچادے...... من حیث شئت من این شئت۔ (آمین)

سوال: قرآن کریم کی ہر آیت پیارے اللہ میاں جی کا کلام ہے، سبھی سر آنکھوں پر، مگر اللہ میاں ہی نے الگ الگ مزاج اور ذوق کے بندے بنائے ہیں، آپ کی پسندیدہ آیات اور سورت کون سی ہے۔ جسے جتنا بھی پڑھیں، دل نہیں بھرتا؟

جواب: زبان و بیان اور کلام کی ایک جنت سجی ہے قرآن میں کیسے احاطہ کیا جائے۔ سورۃ الکہف (آیت۔109) میں اللہ نے کلمات ربی کے حوالے سے جو فرمایا اور یہی مضمون کلمت اللہ کا سورۃ لقمان (آیت۔27) میں آیا۔ یہ آیات اور ہر وہ مقام جہاں اللہ کی تخلیقات اور مظاہرِ فطرت کا تذکرہ ہو دل کو بہت چھوتا ہے۔ وجود اس فخر و انبساط سے بھر جاتا ہے کہ میرے رب نے مجھے اس لائق جانا کہ مجھے قرآن اور اپنی پہچان کے قابل بنادے۔ یعنی خود اپنی عطا سے مسلمان گھر میں پیدا کیا! خاتم الانبیاء، سید المرسلین کا امتی بنایا۔ اللہ کی عظمت و کبریائی کا ادراک عطا کیا۔ قرآن کی سب سے سچی بات یہی ہے (ہماری شرمساری کے لیے) کہ وما قدروا اللہ حق قدرہ... حضرت ابراہیم علیہ السلام کا یہ فرمانا اپنی شرک وجہل میں ڈوبی قوم سے... فما ظنکم برب العالمین اور حضرت نوح علیہ السلام کا یہ شکوہ: مالکم لاترجون للہ وقارا... اپنے معاشرے اور آج کی امت مسلمہ کے لیے اور انسانوں کی حکمرانی کے دلدادگان کے لیے...... (ان کے نعرے بلند کرنے والوں کے لیے) دل کی ہوک بن کر اٹھتی ہے۔ آخرت کے مناظر سامنے آتے ہیں تو جی چاہتا ہے پہاڑ پر چڑھ کر غافل دنیا کو پکاروں...... اس مستقبل کا غم کھاؤ، فکر کرو۔ خود بھی تباہی کی طرف لپک رہے ہیں ہماری نسلیں بہکا بھٹکا رہے ہو! الا ان وعد اللہ حق ولکن اکثرھم لایعلمون ○ (یونس:55)

(سعدیہ عثمان)

سوال: وہ کیا چیز ہے جو آپ کو سب سے زیادہ مسرت سے ہمکنار کرتی ہے؟

جواب: اولاد اور امت مرکز و محور رہی۔ انہی کی چھوٹی بڑی کامیابیاں خوشی دیتی رہیں!

سوال: جوانی کی عامرہ احسان اور آج کی عامرہ احسان میں کہاں کہاں فرق آیا ہے؟ (صلاحیتوں، ذہانتوں، مشغلوں کے حوالے سے)۔

جواب: بے مصرف اوائل جوانی شکر ہے جلد گزر گئی بھول گئی۔ اللہ بھی اسے معاف اور اعمال نامے سے حسب وعدہ صاف کردے۔ اس کے بعد سے زندگی جس راہ پر چلی ’بلٹ ٹرین‘ کی رفتار پر چلی اور یہاں آن پہنچی۔ سب کچھ ایک سا ہی رہا۔ زندگی کی تیز رفتاری پر دم بخود ہوں اور جوانوں کو متوجہ کرنا چاہتی ہوں۔ یوماً او بعض یوم... الا عشیۃ او ضحھا سے بڑی حقیقت دوسری نہیں۔ صلاحیتوں، مشاغل کی جوانی میں درستی کرلیں، اسی سے پہلے کہ زندگی کی گاڑی اڑا لے جائے۔

سوال: اگر آپ لکھانہ کرتیں تو کیا کیا کرتیں؟

جواب: میری مربیات نے قلم تھما کر چلا دیا تو چل رہا ہے...... ورنہ وہ مکرم اساتذہ میری، جس کام پر لگا دیتیں احسن ہی ہوتا! (جاری ہے)

پارس

صالحہ محبوب

''ابیہا بیٹی! کدھر ہو؟......عثمان کہاں ہو تم سب؟......انابیہ، ابوبکر ادھر آؤ، میری بات سنو......ارے کہاں چلے گئے سب؟''

دادی جان بہو، بیٹے اور پورتی پوتے کو باری باری آوازیں دے رہی تھیں۔

اپنی پوری طاقت سے انھوں نے کئی بار آواز دی مگر نئے گھر میں مختصر سامان کی وجہ سے اپنی ہی آواز انھیں دوبارہ گونجتی سنائی دیتی تھی۔ کسی کی طرف سے کوئی جواب نہیں آرہا تھا۔ کسی کے چلنے پھرنے کی کوئی چاپ سرسراہٹ بھی نہ تھی۔ دادی کو اپنی آنکھوں کا اندھیرا کبھی اتنا تکلیف دہ نہ لگا تھا جتنا آج محسوس ہو رہا تھا۔ اس اندھیرے میں بہت سے اندیشے اور خوف آن کھڑے ہوئے تھے۔

ابھی نئے گھر میں ہر جگہ سے ان کی شناسائی بھی نہ ہوئی تھی کہ وہ اپنی لاٹھی ٹیکتی ٹیکتی خود ہی بیٹے بہو اور بچوں کو دیکھ آتیں۔ اس گھر کا فرش بہت چکنا تھا، سو انھیں چکنے فرش پر پھسلنے سے بھی ڈر لگتا تھا، سو ہنوز آوازیں دینے پر ہی اکتفا کر رہی تھیں۔

اچانک انھیں اپنے فون کا خیال آیا جو ان کا برسوں سے ساتھی تھا۔

اندازے سے اس پر نمبر بھی ملا لیتیں اور بات بھی کر لیتیں۔ اپنے تکیے کے نیچے انھوں نے فون کی تلاش میں ہاتھ مارا۔ ننھا سا بٹنوں والا فون اپنی مخصوص جگہ پر موجود تھا۔ اس فون میں تین چار نمبر ہی محفوظ تھے۔ ابیہا، عثمان، دونوں بہو بیٹوں کا اور دونوں بڑے بیٹوں اور اکلوتی بیٹی کا۔ انھوں نے ابیہا کا نمبر ملایا۔

ہر تمنا دل سے رخصت ہوگئی

خواجہ عزیز الحسن مجذوب

ہر تمنا دل سے رخصت ہوگئی
اب تو آ جا اب تو خلوت ہوگئی

وہ ریا جس پر تھے زاہد طعنہ زن
پہلے عادت پھر عبادت ہوگئی

جی رہا ہوں موت کی امید میں
مر ہی جاؤں گا جو صحت ہوگئی

لاکھ جھڑکو اب نہیں پھرتا ہے دل
ہوگئی اب تو محبت ہوگئی

منع شے واعظ ہے وجہ حرص شے
اب تو مے سے اور رغبت ہوگئی

یا تو مسجد رات دن یا مے کدہ
کیا سے کیا اللہ حالت ہوگئی

کر چکے رندی بس اب مجذوب تم
ایک چلو میں یہ حالت ہوگئی

جلد ہی فون دوسری طرف سے اٹھا لیا گیا۔

''ہیلو......!'' ابیہا کی آواز خاصی بھاری تھی۔

''ہیلو ابیہا بیٹی!
تم سب کہاں ہو......؟
بچے کہاں ہیں؟''

دادی نے جلدی جلدی سوالات کی بارش ہی کر دی۔

''جی امی جان! وہ دراصل میں ابوبکر کو لے کر اسپتال آئی ہوں۔ وہ سیڑھیوں سے گر گیا تھا۔ چوٹ لگی ہے، خون بہہ رہا تھا تو میں گھبرا گئی۔ انابیہ اور ابوبکر کو ساتھ لے کر ہسپتال دوڑی، آپ گہری نیند میں تھیں اس لیے بتایا نہیں۔'' ابیہا نے تفصیل بتائی۔

''زیادہ چوٹ تو نہیں لگی؟'' دادی نے فوری سوال کیا۔

''نہیں امی جان! اللہ نے بڑا کرم کیا ہے، بس چار ٹانکے لگے ہیں۔ ڈاکٹر نے پٹی بھی کر دی ہے۔ دوا لے کر ہم واپس آرہے ہیں۔ آپ فکر نہ کریں۔''

بہو نے ساس کو تسلی دی اور ساتھ ہی فون بند کر دیا۔

رضیہ بیگم دل ہی دل میں دعائیں مانگتیں اپنے بستر پر بیٹھی رہیں۔ نجانے یہ معذوری کی وجہ سے تھا یا بڑھاپے کا اثر تھا کہ کسی بھی خبر پر ٹانگوں سے جان ہی نکل جاتی۔ انھوں نے صبح وشام کے اذکار پڑھنے شروع کر دیے۔ حفاظت کی دعائیں انھیں زبانی یاد تھیں۔ وہ صبح شام کے اذکار پابندی اور باقاعدگی سے پڑھتیں اور اپنے سب بچوں کے لیے حفاظت اور عافیت کی دعائیں مانگتیں۔ انھیں کامل یقین تھا کہ یہ مسنون اذکار ہر موقع پر اُن کی اور ان کی اولاد کے لیے حفاظتی حصار بن جاتے ہیں۔

تھوڑی ہی دیر میں ابیہا دونوں بچوں کو لیے آن پہنچی۔ ابوبکر تو سیدھا دادی کی گود میں لیٹ گیا اور انابیہ بھی انھی کے بستر میں آن گھسی۔

رضیہ بیگم آنکھوں سے معذوری کے باوجود بہو کی پریشانی، فکر اور تھکن کو بآسانی محسوس کر رہی تھیں۔ انھوں نے بہو سے کوئی سوال نہ کیا، بس بچوں کو اپنی آغوش میں لے کر ڈھیروں دعائیں پھونکیں، دم کیا۔ پوتی نے خود ہی بھائی کے گرنے کا واقعہ تفصیل سے دادی کو سنا دیا۔

اس سارے واقعے میں قصور چھوٹے بھائی کا ہی تھا وہ خاموشی سے سیڑھی پر چڑھا......اور پھر خود سے اترنے کی کوشش میں نیچے گر گیا۔

بہن سب کچھ دیکھتی رہی مگر ماں کو بلانے یا شور مچانے کی کوشش ہی نہ کی۔ رضیہ بیگم پوتی کی معصومیت پر مسکرا دیں۔ بھلا وہ اسے کیوں ڈانٹتیں کہ وہ خود بھی ابھی چار برس ہی کی تھی۔ ابوبکر بے حد شرارتی اور متحرک بچہ تھا۔ ماں ہر وقت اس کا خیال رکھتی مگر سیڑھیاں چڑھنا اس کا سب سے من پسند مشغلہ تھا، اور آج بھی اسی کام میں چوٹ لگوا بیٹھا تھا۔

تھوڑی ہی دیر میں بہو کھانا لیے ساس کے کمرے میں آگئی۔ رات کے آٹھ بج چکے تھے۔ دادی ظہر کے بعد سوئی تھیں، عصر کے وقت یہ سب کچھ ہوا۔ اسپتال آنے جانے اور ٹانکے لگنے میں دو تین گھنٹے لگ گئے۔ ابوبکر دادی کی گود میں سو چکا تھا اور انابیہ بھی!

''ایبہا بیٹی! اللہ کا شکر ادا کرو اس نے بچے کو کسی بڑی چوٹ سے بچا لیا۔ اب پریشان مت ہو۔''

وہ بہو کی مسلسل خاموشی سے اس کی پریشانی کا اندازہ لگا چکی تھیں۔

''امی جان! آخر یہ سب ہمارے ساتھ ہی کیوں ہوتا ہے؟ پچھلے پورے سال سے عثمان کا کاروبار نقصان میں جا رہا ہے۔ اول تو کوئی کام ملتا نہیں، اگر آرڈر مل جائے تو بل پاس نہیں ہوتے۔ ابھی پچھلے ماہ ان کا کتنا بڑا حادثہ ہوا۔ موٹر سائیکل پوری ہی تباہ ہوگئی۔ پورے دس ہزار روپے اسے ٹھیک کرانے میں لگے اور عثمان کو خود بھی چار روز آرام کرنا پڑا۔ اب بچہ سیڑھیوں سے گر گیا۔ ماتھے پر ٹانکے لگے ہیں، امی مجھے تو لگتا ہے میری قسمت ہی خراب ہے، مسلسل حالات گردش میں ہیں، کہیں سے کوئی خیر کی خبر نہیں......!''

ایبہا کھانا کھانے کے بعد اب چائے کا کپ ہاتھ میں لیے بیٹھی تھی ساس کے پوچھنے پر پھٹ ہی پڑی۔

''ارے بہو! یہ بھی بھلا کوئی مشکلیں ہیں؟ یہ سب تو چھوٹے چھوٹے اسپیڈ بریکر ہیں۔ ذرا ذرا سی رکاوٹیں جو ہر انسان کی زندگی میں آتے رہتے ہیں۔ میں نے چار بچے پالے ہیں۔ آئے دن کسی نہ کسی بچے کو چوٹ لگ جاتی۔ کسی کے سر پر اور کسی کے پاؤں میں۔ ایک بار چاروں بچوں کو ایک ساتھ خسرہ نکلا...... اور بخار تو اکثر ہی ہو جاتا، بھلا اب ہم ان سب کو مصیبت اور گردش کہیں گے؟ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے ہمیں یہ بچے دیے ہیں، صحت مند ہیں، ایسی چوٹیں تو بچوں کو لگتی رہتی ہیں۔''

دادی نے پیار سے ابوبکر کا منہ چوما اور بستر پر لٹا دیا۔

''امی! چلیں بچوں کو چوٹیں تو لگتی رہتی ہیں، مگر یہ مالی تنگی! جب سے یہ گھر بنا ہے مسلسل مالی تنگی آ رہی ہے۔ عثمان کا ہاتھ کس قدر تنگ ہے، بمشکل ہماری ضرورتیں پوری ہوتی ہیں، ایک صرف آپ کی پنشن کا سہارا ہے۔'' ایبہا افسردگی سے بولی۔

''بیٹی! اگر تمھارے سر پر چھت ہے، پیٹ میں روٹی اور تن پر کپڑا تو تم کہاں سے تنگ دست ہوگئیں۔ ماشاء اللہ اپنا گھر ہے، دن میں تین وقت کھانا کھاتے ہیں، صاف ستھرا اور اچھا پہنتے ہیں۔ باہر اس قدر سردی ہے، اس میں گرم لحاف میں سکون سے بیٹھتے ہیں پھر بھلا اتنے شکوے کیوں؟ اللہ پاک کا شکر ادا کرنے کی عادت ڈالو تو یہ سب نعمتیں تمھیں محسوس ہونے لگیں گی۔

''بھلا اتنی ساری مصیبتوں پر شکر کیسے کیا جا سکتا ہے؟ کہ اے اللہ تیرا شکر ہے کہ عثمان کی موٹر سائیکل حادثے میں تباہ ہوگئی، اے اللہ! تیرا شکر کہ ان کا کام ٹھیک نہیں چل رہا، بل بھی نہیں مل رہے، اے اللہ! تیرا شکر کہ میرے بچے کو چوٹ لگ گئی۔ عین ماتھے پر ٹانکے لگوانے پڑے۔ امی! کیا آپ اس عمر میں اپنی بینائی چلے جانے پر شکر ادا کرتی ہیں؟''

ایبہا پریشانی اور فکر میں کچھ زیادہ ہی بول گئی۔

''ہاں بیٹی! میں اس معذوری پر اپنے رب کا شکر ہی ادا کرتی ہوں، صرف نظر ہی تو نہیں آتا، زندگی کے پچاس برس دنیا کی ہر نعمت کو دیکھا ہے۔ چیزیں، رنگ، لوگ سب کو دیکھا۔ اب اگر نظر نہیں آتا تو دماغ، کان، ٹانگیں، ہاتھ سب تو سلامت ہیں۔ اگر معذور ہو کر مفلوج ہو کر پلنگ پر پڑ جاتی تو کیا کر لیتی۔ یہ دماغ ہی خراب ہو جاتا تو اللہ کو بھی بھول جاتی اور خود کو بھی، میں تو اپنے رب کا ہر وقت شکر ادا کرتی ہوں۔''

رضیہ بیگم بولیں۔

''امی جان! میں تو بہت گناہ گار انسان ہوں۔ مجھ میں اتنا حوصلہ نہیں کہ اپنی مصیبت پر بھی اللہ کے آگے شکوے نہ کروں۔'' ایبہا افسردگی سے بولی۔

''بیٹا! مصیبت آنے پر اگر مومن واویلا کرتا ہے، شکوے کر کے شکائتیں کرتا ہے تو وہ مصیبت اس کے لیے آزمائش بلکہ سزا ہے۔ اگر صبر کرے تو اُس کے گناہ معاف ہو جاتے ہیں، اور اگر شکر کرے تو اُس کے درجے بلند ہو جاتے ہیں، تو بھلا ہم اپنے درجات بلند کیوں نہ کریں......؟ تم ابوبکر کی ماں ہو اس کی تکلیف پر اتنی پریشان ہوگئیں۔ میرا رب تو ہم سے ستر ماؤں سے زیادہ پیار کرتا ہے۔ بھلا ہمیں مشکل میں ڈال کر اللہ خوش ہوتا ہے! ہرگز نہیں، بلکہ وہ تو ہماری نیکیاں بڑھاتا ہے اور درجے بلند کرتا ہے۔''

میں نے بنائی رس ملائی

فائزہ واجد۔ گوجرانوالہ

میں ٹھہری سدا کی رس ملائی کھانے کی شوقین، سو تراکیب کی دنیا کے دشت وصحرا چھان مارے، لیکن مجال ہے جو کامیابی نے قدم چومنے کی کوشش بھی کی ہو۔ کبھی سخت ڈھیلے بن گئے تو کبھی پتلی کھیر۔ خیر ایک دن عقدہ کھلا کہ کویت والے خالو رس ملائی بنانے میں بڑے ماہر ہیں، سو فوراً اُن کی شاگردی اختیار کرنے کا سوچا۔

وہ ایک روشن صبح تھی جب خالہ کے گھر رخت سفر باندھا۔ وہاں خالو جی کی نگرانی میں رس ملائی بنائی جو واقعی بہترین بنی۔ اب زندگی میں جو پہلی دفعہ یہ کارنامہ سرانجام دے لیا تو سوچا کیوں نہ ٹھنڈی ٹھنڈی نرم ملائم سی رس ملائی سے جماعت والوں کا اکرام کیا جائے۔ سو دودھ منگوایا اور چولھے پر کاڑھنے رکھ دیا اور مابدولت رس ملائی کی گولیاں بنانے میں مصروف ہوگئے۔

گولیاں بنا کر دودھ میں ڈال دیں۔ اُدھر تھوڑی ہی دیر میں گولیاں دودھ میں قلابازیاں کھاتی پھولنے لگیں اور اِدھر میں خوشی سے پھولنے لگی۔ میری خوشی گولیوں سے برداشت نہ ہوئی اور انھوں نے بل کھا کر سکڑنا شروع کر دیا۔

اب میں کبھی پاس کھڑی امی کو دیکھوں اور کبھی ڈھیر ساری رس ملائی کو جس میں سلوٹ زدہ سخت گولیاں گویا میرا منہ چڑھا رہی تھیں۔

''انھیں بارڈر پر بھجوا دو۔'' اباجی کا تبصرہ کانوں سے ٹکرایا۔

''نہیں نہیں...... یوں کرو سنبھال کر رکھ لو، شیطان کو مارنے کے کام آئیں گی۔'' پاس سے کزن دانت نکالتی ہوئی بولی۔

خیر اماں جی نے رس ملائی پر کوئی خاص فارمولا لگایا اور تھوڑی ہی دیر میں رس ملائی کسٹرڈ میں تبدیل ہوگئی۔ جماعت والوں کو یہ کسٹرڈ بہت پسند آیا۔ امیر صاحب فرمانے لگے کسٹرڈ بہت خلوص سے بنایا گیا ہے۔ خیر وہ دن اور آج کا دن رس ملائی بنانے سے ہم نے اب بھی توبہ نہیں کی۔ ان شاء اللہ سیکھ کر ہی دم لیں گے۔

"امی جان! یہ سب کہنا آسان ہے لیکن کرنا بہت مشکل بلکہ ناممکن، خالی ہاتھ اور خالی جیب ہم سے سب کچھ چھین لیتے ہیں۔ اعتماد، حوصلہ، ہمت اور کبھی کبھی ایمان بھی۔ خالی جیب کے ساتھ اپنی عزت اور سفید پوشی کا بھرم رکھنا بہت مشکل کام ہے۔ علی اور عمر بھائی آپ سے ملنے آتے ہیں مگر اُن کے سامنے خود کو معاشی طور پر مستحکم پیش کرنا کتنا کٹھن ہوتا ہے۔ دل ڈرتا ہے کہ ماں کی محبت میں وہ یہاں رہنے پر ہی راضی نہ ہو جائیں۔ ہم کس طرح اپنی مجبوریاں چھپائیں گے؟ امی آپ تو دیکھ نہیں سکتیں محسوس تو کرتی ہوں گی ناں کہ مسلسل وہی کپڑے دھل دھل کر کیسے اپنی رنگت اور خوبصورتی کھو چکے ہیں۔ ہمارے تو حالات وہی ہیں کہ سر ڈھانکو تو پاؤں ننگے اور پاؤں ڈھانکو تو سر......!"

ابیہا نے آج تو ساس کے سامنے دل کھول کر رکھ دیا تھا۔

"بیٹی! اگر ہم دوسروں کے جوتوں، کپڑوں اور چہروں سے ان کی آسودگی کے اندازے لگاتے ہیں تو ہمیں ایسی ہی تکلیف ہوگی۔ بیٹی! اپنے نبی پاک حضرت محمد ﷺ کے گھر کا نقشہ سوچا کرو۔ کپڑوں کے پیوند اور مسلسل فاقہ تو اپنے رب کی نعمتیں تمہیں اپنے چاروں طرف دکھائی دینے لگیں گی۔ یہ وقت کچھ مشکل کا ہے، اس میں خود بھی حوصلہ کرو، ہمت کرو اور اللہ سے جڑ جاؤ، اس سے مدد مانگو، اس سے عافیت مانگو، توکل اور شکر۔ ان شاء اللہ حالات بہتر ہو جائیں گے۔ بیٹی! اس وقت اگر تم شور اور واویلا کرو گی تو کیا فائدہ؟ بس اپنا ہی نقصان ہوگا۔ عثمان کی ہمت بھی تم نے ہی بڑھانی ہے۔ صبح شام حفاظت کے مسنون اذکار پڑھ کر اس پر پھونکا کرو، خود بھی پڑھا کرو اللہ بہتر کرے گا۔ یہ کلمات ہمارا ہتھیار اور حفاظت دونوں ہیں۔" رضیہ بیگم اٹھ کھڑی ہوئیں۔

وضو کر کے نماز ادا کرنے اور پھر اپنے رب کے حضور شکرانے کے نوافل پڑھنے جس نے ان کے پوتے کو محفوظ رکھا، بڑی چوٹ سے بچا لیا۔

☆......☆

وقت نے ایک اور ہلکی سی زقند لگائی۔ ابوبکر کا ماتھے کا زخم نشان چھوڑ گیا۔

عثمان صاحب کا کاروبار اپنے فطری اتار چڑھاؤ کے ساتھ مسلسل ترقی کی منزلیں طے کر رہا تھا۔ ان کی موٹر سائیکل پہلے ایک ننھی سی سوزوکی مہران میں بدلی اور پھر ایک بڑی چمکتی ہوئی کار میں۔ رضیہ بیگم کے شکر کے نوافل میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ مشکل وقت سے زیادہ عبادت وہ آسودگی اور آسانیوں میں کرتی تھیں۔ انابیہ اور ابوبکر غیر معمولی ذہین بچے تھے۔ اسکول میں تعلیمی میدان کے ساتھ ساتھ کھیلوں میں بھی دونوں خوب نمایاں رہتے۔ انابیہ فن تقریر میں خوب ماہر تھی۔ بچوں کے کمرے کتابوں، ٹرافیوں اور شیلڈوں سے بھرے تھے۔ دادی جان اب آنکھوں کے ساتھ ساتھ دیگر بڑھاپے کے امراض کا بھی شکار ہوتی جا رہی تھیں، مگر شکر کی عادت ہنوز برقرار تھی۔

شوگر کی تشخیص پر بھی شکر کے نوافل ادا ہوئے۔

ابوبکر ان نوافل پر خوب ہنسا کہ دادی نے شکر ادا کیا کہ کوئی امیروں والی بیماری بھی انھیں لگی ہے۔ وہ تو گھٹنوں کی تکلیف پر بھی شکر الحمدللہ پڑھتی تھیں۔ کرسی پر بیٹھ کر نماز پڑھنے پر بھی راضی تھیں اور صبح شام ڈھیروں دوائیں کھانے پر بھی۔

انابیہ میڈیکل کے تیسرے برس میں پہنچی تو دادی بالکل ہی بستر سے جا لگیں۔

ابوبکر کے میڈیکل میں داخلے تک ان کی یادداشت ختم ہو چکی تھی۔ خود فراموش سی کیفیت ہوتی۔ بیٹوں کو چھو کر دیکھتیں اور پھر بس ایک ہی فرمائش کرتیں۔ نماز پڑھوا دو۔ رشتے بھول گئیں، نام فراموش ہو گئے، بس یاد تھا تو نماز اور ان کی دعائیں......!

سب بچوں نے خوب جنت کمائی اور ماں کی دل سے خدمت کی اور پھر ایک روز وہ اپنے رب کی بہترین بندی اپنے رب کے حضور حاضر ہو گئیں۔

ابیہا کو ساس کے بعد اپنے گھر میں بہت خالی پن کا احساس رہنے لگا۔ نجانے اسے بچوں اور شوہر کو کالج اور فیکٹری بھیج کر بھی اطمینان کیوں نہ ہوتا۔ وہ نماز پڑھنے امی جان ہی کے کمرے میں آ جاتیں ان کی مخصوص جائے نماز پر کھڑے ہو کر نماز پڑھتی اور پھر ان کی طرح صبح و شام کے اذکار کرتی، اپنے بچوں اور شوہر کی حفاظت کیلئے دعائیں مانگتی۔ اس کام سے اسے سکینت حاصل ہوتی، اطمینان ملتا اور خوشی حاصل ہوتی۔

ایک لمبے عرصے تک اسے مصیبت میں شکر کا امی جان کا فلسفہ سمجھ میں نہیں آیا تھا، مگر شاید یہ شکر کے نوافل نسلوں میں روایتیں ڈال دیتے ہیں۔ ان دعاؤں کی فضیلتیں نسلوں کو صراط مستقیم پر ڈال دیتی ہیں۔

انابیہ اپنی ماں کو دادی کی طرح نماز اور قرآن سے جڑتا دیکھ کر نئے نتائج اخذ کرتی کہ اگر کسی انسان کو مسلسل ایک ہی ماحول میں رکھا جائے تو وہ اس میں ڈھل جاتا ہے۔ پرندے کو پنجرے میں قید رکھا جائے تو وہ آزاد فضاؤں میں اڑنا بھول جاتا ہے۔ امی نے دادی کے ساتھ زندگی کے بیس برس گزارے اور اب بالکل ان جیسی ہو گئیں۔

عثمان صاحب کے خیال میں امی جان نے اپنی روحانی صلاحیتیں بہو بیگم کو ورثے میں دے دی تھیں۔ ان کا یقین تھا کہ ان دونوں کی دعاؤں نے انھیں زمین سے اٹھا کر آسمان پر پہنچا دیا تھا۔ اور ان کے دونوں بھائیوں کے خیال میں ان کے گھر پر اللہ کا خصوصی کرم تھا جس کی وجہ سے عثمان صاحب ہر مشکل سے بحفاظت نکل آتے۔

ابیہا یہ سب کچھ سن کر مسکرا دیتی۔ وہ کیا بتاتی کہ یہ ہر مشکل میں شکر والے فلسفے کو سمجھنے میں اسے پوری عمر لگ گئی تھی۔ ان بیتے ہوئے برسوں میں رضیہ بیگم نے بغیر کہے اسے بہت کچھ سکھایا تھا۔ انھیں کبھی کسی میں کوئی برائی، کمی یا کوتاہی نظر ہی نہیں آئی تھی۔ یہاں تک کہ ابیہا کے کاموں میں کوتاہی بھی انھیں کبھی ناگوار نہ ہوئی۔ برسوں انھوں نے سب کو صرف اور صرف دعائیں ہی دی تھیں۔ عثمان کی کسی بھی مشکل پر تو وہ بے حد بے چین ہو جاتیں۔ ان کی تہجد میں لمبی لمبی دعائیں بیٹے کے لیے بہت سے دروازے کھول دیتیں۔ دونوں بچے اس قدر ذہین اور باصلاحیت تھے کہ انھیں اسکولوں، کالجوں کی فیس بھی وظائف کی صورت میں مل جاتی۔ میرٹ اور کامیابیاں ہر ہر موقع پر ان کے قدم چومتی رہیں۔

ابیہا نے دوسروں کی بات تحمل سے سننا انہی سے سیکھا۔ اس کی ساس بہترین ماہر نفسیات تھیں۔ ہر مسئلہ بہت توجہ اور غور سے سنتیں اور سادہ سا مشورہ دے دیتیں۔ اپنی معذوری اور بڑھاپے کی کمزوریوں کو کشادہ پیشانی سے قبول کیا اور الحمدللہ کے ورد کے ساتھ تمام تکالیف کا مقابلہ کیا۔ بھلا اس شکر گزاری کے ٹریننگ کیمپ میں مسلسل بیس پچیس برس گزار کر ابیہا کیسے ہیرا نہ بنتی!

یقیناً دادی کی شخصیت کے پارس نے اسے سونا بنا دیا تھا۔

☆☆☆

کبھی کبھی تو حارث میرے پاس آنے سے ہی انکاری ہو جاتا ہے، اِن حالات میں اُس کی تربیت کیسے کروں؟'' ہانیہ نے سب سے بڑی جیٹھانی صاحبہ کے سامنے اپنا مسئلہ رکھا۔

''تم اکثر پوچھتی ہونا کہ صولت ایسا کیوں ہے؟ حالانکہ آپ تو بتاتی ہیں کہ آپ نے اُسے بچپن رکھ کر سنت کے مطابق سلیقے سے کھانا سکھایا تھا، لیکن آج وہ ہر عمل میں اکھڑ، بدتمیز کیوں ہے؟ اُس کی وجہ یہی ہے۔''

بھابی اپنے بڑے بیٹے کے بارے میں بتاتے بتاتے سانس لینے کو رکیں۔

''میں کبھی کبھار اُس کی بدتمیزی پر اس کا جیب خرچ بند کر دیا کرتی تھی تو امی اُسے پیسے دے دیا کرتی تھیں۔ اس جیسی بہت باتیں جب لگاتار ہونے لگیں تو اس کے دل سے میری اہمیت ختم ہوگئی۔ اب جب وہ بدتمیزی کرتا ہے اور یہ سب اُسے برا کہتے ہیں تو میں اُس کی حمایت کرتی ہوں۔ سبھی کو برا لگتا ہے کہ صالحین بھابی صولت کی ناجائز حمایت کرتی ہیں لیکن ہانیہ! میں ایسا اس لیے کرتی ہوں کہ میرے نزدیک قصوروار صولت نہیں ہے۔'' صالحین بھابی کی بات نے ہانیہ کو مزید پریشان کر دیا۔

شمارہ ۱۰۰۰ میں صفحہ 131 کے بعد کہانی ''چار بچے چار کہانیاں'' کا اختتام شائع ہونے سے رہ گیا! اس غلطی پر معذرت خواہ ہیں۔ بقیہ کہانی ملاحظہ فرمائیے:

''پھر مجھے کیا کرنا چاہیے؟ کیا حارث کے ساتھ بھی یہی سب ہوگا؟''

ہانیہ کی بات پر صالحین بھابی نے نفی میں گردن ہلائی۔

''ان شاء اللہ ایسا نہیں ہوگا، کیوں کہ فہد تمھارا ساتھ دے گا۔''

''اِس کا مطلب ہے کہ احد بھائی نے بھی آپ کا ساتھ نہیں دیا تھا۔''

''چھوڑو ہانیہ! بس اللہ سے گڑگڑا کر حالات کی بہتری کے لیے دعا کرو۔''

کچھ عرصے بعد ہی فہد کی پوسٹنگ دوسرے شہر میں ہوگئی اور پھر ہانیہ بلا کسی روک ٹوک کے اُس کی تربیت کرنے کے لیے آزاد ہوگئی۔

☆......☆

سات سال بعد:

ساس امی ہانیہ کے گھر پر رہنے کے لیے آئی تھیں۔ بچے اب بڑے ہو رہے تھے۔

''فہد! وہ......'' امی کہتے کہتے رُک گئیں۔

''جی امی کہیے ناں......!''

''نہیں، کچھ نہیں......''

''ارے امی! بلا جھجک کہیے، یہ آپ کا اپنا گھر ہے۔''

ہانیہ نے اُن کے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔

''صولت مجھ سے بہت بدتمیزی کرنے لگا ہے۔ اگر میں کچھ کہوں تو ایسے جھڑک دیتا ہے جیسے میں چھوٹی سی ہوں۔''

''آپ نے بھابی کو بتایا؟''

''نہیں، اسے نہیں بتایا۔''

''جب وہ آپ کو جھڑک رہا ہے تو بھابی کو کیا خاطر میں لاتا ہوگا۔''

ہانیہ نے تشویش سے کہا۔

''بات یہی ہے، صالحین سے کہنے کا بھی فائدہ نہیں۔ ابھی سترہ سال کا ہے لیکن چھوٹے بہن بھائی یہاں تک کہ ماں پر بھی رعب جماتا ہے۔''

''امی! جہاں تک صالحین بھابی کا تعلق ہے، اُن سے جہاں تک ہو سکا اس کی اچھی تربیت کی ہے لیکن بڑھتی ہوئی عمر کے بچوں کو باپ کی توجہ اور نگرانی کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔'' فہد نے صاف گوئی سے کہا۔

''چاچا بھی تو باپ کی جگہ ہوتا ہے، آپ علمائے کرام اور اہل اللہ کی مجالس میں جاتے ہی ہیں، امی کے شہر بھی جاتے رہتے ہیں تو کبھی صولت کو ساتھ کیوں نہیں لے جاتے؟ وہ بھی گھر کا بچہ ہے، ہم سب کو اس کی فکر کرنی چاہیے۔''

ہانیہ کی بات نے فہد کو لاجواب کر دیا۔

ہانیہ افسردگی سے امی کی جانب دیکھ کر سوچ رہی تھی کہ بے شک اصل سے سود پیارا ہوتا ہے اور بڑے پوتے یا پوتی، نواسے یا نواسی کی تو بات ہی الگ ہے۔ یوں لگتا ہے گویا جگر گوشہ ہاتھوں میں آ گیا لیکن تربیت کے لیے کبھی کبھار کی سرزنش بھی ضروری ہے۔ نیز بچوں کے سامنے ان کے والدین کی برائی یا تربیت کے وقت ناجائز حمایت انھیں مزید خودسر بنا دیتی ہے۔ اس پر طرہ یہ کہ سزاوار پھر بھی ماں ہی ٹھہرتی ہے۔

☆☆☆

تمام دینی خوبیوں کا تنہا مالک کوئی نہیں

مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ سے ایک صاحب نے سوال کیا: ایک ڈاڑھی منڈانے والے کے ساتھ لڑکی کا رشتہ کروں یا نہ کروں؟ ڈاڑھی والے جو ملتے ہیں تو دال روٹی کا ان کے یہاں اطمینان نہیں اور جہاں اس کی تھوڑی بہت امید ہے، وہاں خرابی یہ ہے کہ ڈاڑھی منڈانے والے لڑکے ملتے ہیں۔ مولانا تھانوی نے فرمایا: میرا خیال ہے کہ اس زمانہ میں پوری دین داری ڈاڑھی والوں میں بھی نہیں۔ پس ایک ڈاڑھی منڈانے کا گناہ کر رہا ہے، دوسرا شہوت پرستی کا گناہ کر رہا ہے، تو نری ڈاڑھی لے کر کیا کریں گے۔ ڈاڑھی منڈانے کے سوا اور باتیں لڑکے میں اچھی ہوں تو اس کو گوارا کر لیا جائے، بلکہ اس برتاؤ سے اغلب ہے، ڈاڑھی کا مسئلہ بھی اس کی سمجھ میں آ جائے۔ (کمالات اشرفیہ، 239) مولانا مناظر احسن گیلانی رحمہ اللہ نے یہ قول نقل کر کے لکھا ہے: لوگوں نے خاص خاص گناہوں کو پکڑ لیا ہے، گویا گناہ گار ہونے نہ ہونے کا معیار بس وہی ہیں، انھی گناہوں میں ایک ڈاڑھی بھی ہے۔ ایک شخص غیبت کرتا ہے، بدنظر ہے اور عملی طور پر بے احتیاط ہے، لیکن لمبی ڈاڑھی رکھتا ہے، اس پر لوگوں کو کوئی اعتراض نہیں ہوتا، ایک بے چارہ ان عیوب سے بری ہے، صرف ڈاڑھی منڈانے کا گناہ کرتا ہے، تو سمجھا جاتا ہے ڈاڑھی والے صاحب سے ڈاڑھی منڈانے والے صاحب کو کیا نسبت، حالانکہ جیسے ڈاڑھی منڈانا گناہ ہے، ڈاڑھی والوں کے گناہ اس سے کم نہیں۔

سمیہ۔ جامعہ علوم اسلامیہ ملتان

آپ اپنے بچوں کا احترام کرتے ہیں؟

ایک محفل میں میری ملاقات کچھ والدین سے ہوئی جنھیں اپنے بچوں سے یہ شکایت تھی کہ وہ بے ادب اور گستاخ ہو گئے ہیں۔

میں نے پوچھا: ''کیا آپ اپنے بچوں کا احترام کرتے ہیں؟''

کہنے لگے: ''ہم ان سے پیار کرتے ہیں اور ان کا خیال رکھتے ہیں۔''

میں نے پھر پوچھا: ''کیا آپ ان کی رائے کا احترام کرتے ہیں؟''

کہنے لگے: ''بچوں سے محبت کی جاتی ہے اور بزرگوں کا احترام کیا جاتا ہے۔''

یہ وہ مکالمہ ہے جو میں اپنی زندگی میں بیسیوں والدین سے کر چکا ہوں۔

میں ایسے والدین کو اپنی زندگی کے چند واقعات سناتا ہوں۔

آئیں اُن میں سے دو آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔

پہلا واقعہ میری نانی اماں کے حوالے سے ہے۔ جب میں بچہ تھا تو گرمیوں کی چھٹیوں میں پشاور سے لاہور اپنی نانی اماں سے ملنے جایا کرتا تھا۔ وہ مزنگ روڈ پر رہتی تھیں۔ مجھے اپنی نانی اماں سے بہت پیار تھا۔ میں اُن کی بہت عزت کرتا تھا۔ اب جبکہ میں ایک ماہر نفسیات بن گیا ہوں، میں اپنے آپ سے پوچھتا ہوں کہ آخر میری نانی اماں میں وہ ایسی کیا خاص بات تھی کہ میں اُن کی سب رشتے داروں سے زیادہ عزت کرتا تھا۔ اب مجھے وہ راز پتا چل گیا ہے۔

اور وہ راز یہ ہے کہ وہ میرے بارے میں کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے مجھ سے میری رائے پوچھتی تھیں۔

''سہیل بیٹا! آپ اورنج جوس پییں گے یا دودھ؟''

''نانی اماں! دودھ پیوں گا۔''

''سہیل بیٹا! ٹھنڈا دودھ پییں گے یا گرم؟''

''ٹھنڈا نانی اماں، برف ڈال کر۔''

باقی رشتے دار مجھے بچہ سمجھ کر میری روزمرہ زندگی کے بارے میں خود ہی فیصلے کرتے تھے، لیکن میری نانی اماں مجھے بچہ سہی مگر ایک شخص سمجھتی تھیں اور میری رائے کو اہمیت دیتی تھیں۔

دوسرا واقعہ میرے والد صاحب کا ہے۔ جب میں دس سال کا تھا تو میری چھوٹی بہن عنبر پانچ سال کی تھیں۔ ایک دن کھیلتے کھیلتے انھیں مجھ سے دھکا لگا۔ وہ گر گئیں اور انھیں چوٹ آئی۔ شام کو جب ہم سب کھانا کھا رہے تھے تو عنبر نے والد صاحب سے میری شکایت کی۔

''ابو جان! سہیل بھائی نے مجھے دھکا دیا تھا اور مجھے چوٹ آئی ہے۔''

والد صاحب نے کہا: ''سہیل بیٹا! آپ اپنی چھوٹی بہن سے معافی مانگیں۔''

زندگی میں پہلی بار میری انا آڑے آئی۔ چھوٹی بہن سے معافی مانگنا میری مردانگی کے خلاف تھا۔ میں خاموش رہا۔ چند ہی لمحوں میں میرا سراپا پسینے سے شرابور ہو گیا۔

والد صاحب نے کہا: ''ہم سب اس وقت تک کھانا نہیں کھائیں گے، جب تک سہیل عنبر سے معافی نہیں مانگے گا۔''

میں نے آخر کار اپنا تھوک نگلا اور نیچی نظر سے کہا: ''عنبر! مجھے معاف کر دیں۔''

میں سمجھا طوفان گزر چکا ہے، لیکن ایسا نہ تھا۔

والد صاحب نے عنبر سے پوچھا:

''کیا آپ نے سہیل بھائی کو معاف کر دیا ہے؟''

جب عنبر نے کہا، جی معاف کر دیا ہے، تب ہم نے دوبارہ کھانا کھانا شروع کیا۔

یہ واقعہ چند لمحوں کا تھا لیکن اس کے اثرات دیرپا تھے۔ اس واقعے سے میں نے نہ صرف عنبر کا بلکہ تمام خواتین کا احترام کرنا سیکھا۔

ایک دفعہ میرے والد صاحب سے میرے معاملے میں ایک غلطی ہو گئی تو احساس ہونے پر انھوں نے خود مجھ سے معافی مانگی۔ اس واقعے سے میرے دل میں ان کا احترام اور بھی بڑھ گیا۔

جب آپ بچوں کا احترام کرتے ہیں تو پھر وہ نہ صرف آپ کا بلکہ محبت کرنے والی اتھارٹی کا احترام کرنا سیکھتے ہیں، پھر وہ اسکول میں اساتذہ کا، کالج میں پروفیسروں کا اور زندگی میں قانون کا احترام کرتے ہیں۔

ڈاکٹر خالد سہیل

والدین اور اساتذہ بچوں کی دو طرح سے تربیت کر سکتے ہیں۔ محبت پیار اور احترام سے یا غصہ رعب اور خوف سے۔

جو بچے والدین سے خوفزدہ رہتے ہیں، وہ بڑے ہو کر نفسیاتی مسائل کا شکار ہوتے ہیں اور ڈاکٹر یا ماہر نفسیات سے بھی ملتے ہوئے ڈرتے ہیں، کیونکہ وہ اپنے والدین کی طرح ان سے بھی خوفزدہ رہتے ہیں۔

میرے والد کہا کرتے تھے کہ اختلاف رائے اور دشمنی میں بہت فرق ہے۔ اختلاف رائے دوستی اور مکالمے کے لیے مثبت اور دشمنی منفی رویہ ہے۔ میرے شاعر چچا عارف عبدالمتین بھی کہا کرتے تھے کہ صاحب الرائے لوگ بہت سوچ سمجھ کر اپنی رائے قائم کرتے ہیں، اس لیے ہمیں اُن کی رائے کا احترام کرنا چاہیے۔

میں نے اپنی زندگی کے تجربے مشاہدے مطالعے اور تجزیے سے یہ سیکھا ہے کہ اگر ہم چاہتے ہیں کہ دوسرے لوگ ہماری رائے کا احترام کریں تو ہمیں دوسرے لوگوں کی رائے کا بھی احترام کرنا سیکھنا چاہیے۔

اگر ہم اپنے بچوں کا احترام کریں گے، انھیں چھوٹا مگر انسان سمجھیں گے تو وہ بھی بڑے ہو کر دوسروں کا احترام کرنا اور مکالمہ کرنا سیکھیں گے۔

☆☆☆